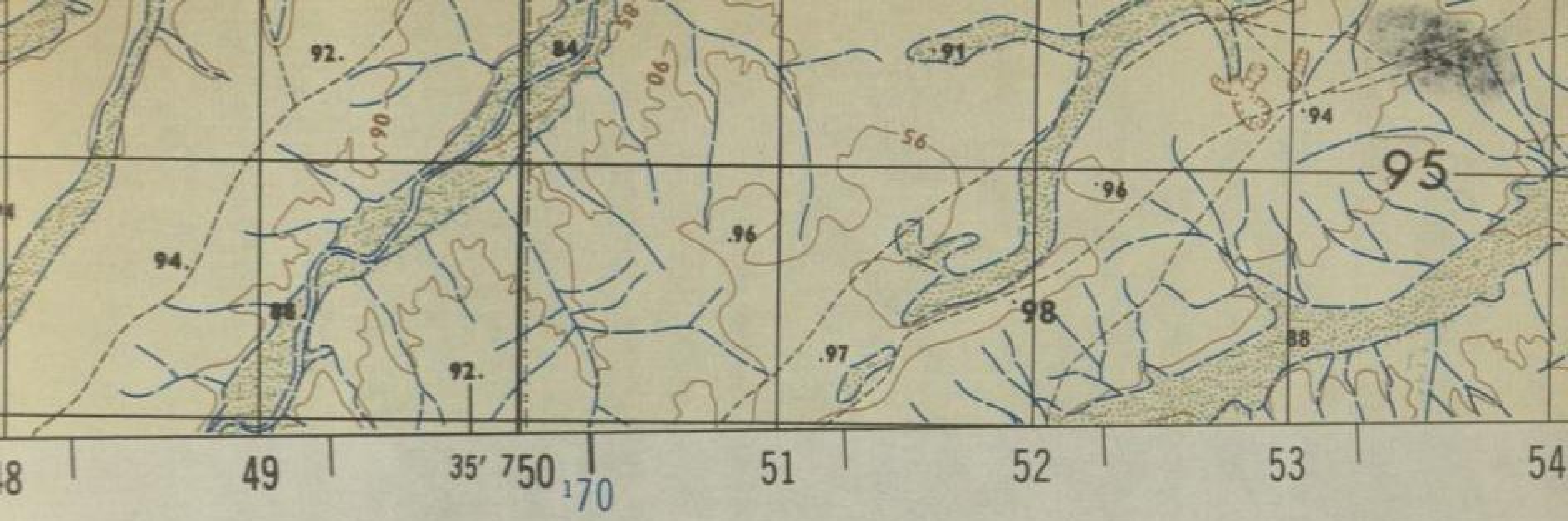
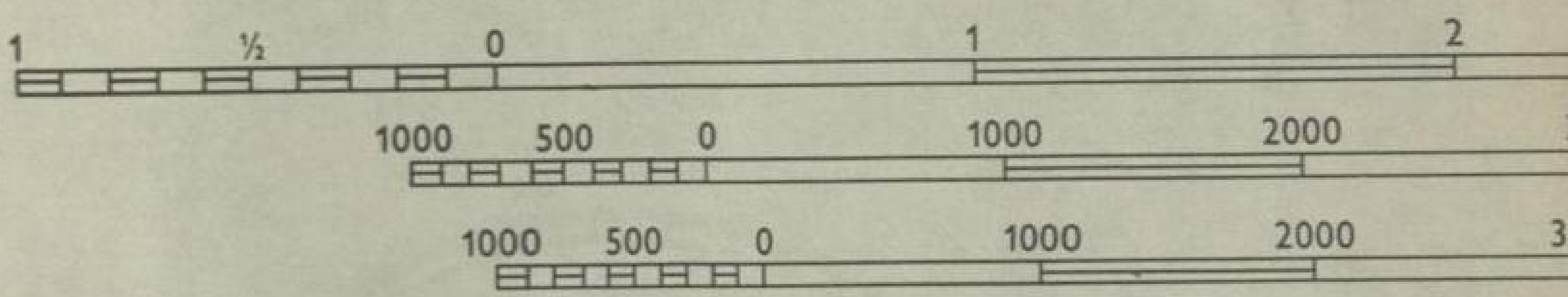
مقام قرآن

تالیف: علامہ سید محمد حسین طباطبائی قدس سرہ
ترجمہ: سید نیاز محمد ہمدانی





0

ENTS AND BUILDINGS

p area
Main
Local
es wide: Main; Local
r more lanes wide
ne wide
NW 21

MISCELLANEOUS CULTURAL ITEMS

Locality name .... UMM TWAINEJ
Antiquity name .... Red Palace
Prominent wall. Prominent wall, ruined
Wall, sea wall, fence, field boundary
Cemetery, Moslem
Cemetery, Christian
Police post, isolated
Tower, chimney, mast or other landmark feature
Dam .... dam
Ruin .... ∴ R
Sports ground
Meteorological station. Radio transmitting station
Photo centre 39/112
Airport or airfield. Runway. Helicopter landing pad
Quarry : Stone ; Gravel ; Sand

POWER LINES, OIL PIPELINES ETC.

Power line 132kv
Power line 11, 33 or 66kv
Oil pipeline, supported or surface: Main; Minor
Oil pipeline, underground or undersea: Main; Minor
Gas pipeline, underground: Main; Minor .... gas gas
Direction of flow in pipeline
Oil well. Disused oil well
Oil tank. Pipeline crossing point
Offshore installation

HYD

Shor
High
Navig
Port
River
Lake,
Coas
Land
Rese
Wat
Pum
Wat
Wat
Drai

VEG

Isola
Line
Tree
Plan
Cult
Gard
Park
Scru
Des
Coa

DISTRIBUTION

veal this document outside UK Government
rom the Director General of Military Survey.

~~LIMITED DISTR~~

UK officials are not to ~~release this map~~
~~without permission from the Directo~~

مقامِ قرآن

تالیف

علامہ سیّد محمّد حسین طباطبائی قدس سرہ

ترجمہ

سیّد نیاز محمد ہمدانی

کتاب ــــــــــ مقامِ قرآن
تالیف ــــــــــ علامہ سیّد محمد حسین طباطبائی قدس سرہ
ترجمہ ــــــــــ سیّد نیاز محمّد ہمدانی
ناشر ــــــــــ مجلس تعلیم القرآن
تعداد ــــــــــ ایک ہزار
بار ــــــــــ اوّل
قیمت ــــــــــ Rs [redacted] /

فہرست مندرجات

تعارف

زیر نظر کتاب عالم اسلام کے بطل جلیل اور مسلمانوں کے سرمایہ صد افتخار، مفسر کبیر، محدث بصیر، فیلسوف شہیر، فقیہہ خبیر اور عارف کم نظیر علامہ سید محمد حسین طباطبائی رضوان علیہ کی کتاب "قرآن در اسلام" کا رواں اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں علامہ نے قرآن شریف اور علوم قرآن کی تاریخ اور بعض دیگر پہلوؤں پر جس اختصار اور جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ نزول قرآن کی تاریخ، صدر اسلام میں مسلمانوں کا قرآن شریف کے بارے میں اہتمام، جمع و تدوین قرآن، محکم و تشابہ، تاویل و تنزیل، ناسخ و منسوخ، حقیقت وحی، جبریل، نبوت، ان امور سے متعلق معاصر مغربی مفکرین کی آراء کا تنقیدی جائزہ --- تفسیر قرآن کا آغاز و ارتقا، مفسرین کے طبقات، شان نزول، تفسیری احادیث .... میں سے ہر موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر علامہ نے اس کتاب میں ان تمام موضوعات پر کافی اور مختصر بحث کر کے ایک نہیں کئی سمندروں کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

"قرآن در اسلام" مذکورہ، موضوعات سے متعلق کافی معلومات تو فراہم کرتی ہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ قرآن فہمی کے شائقین کو قرآن فہمی کے بہت سے ضروری اصولوں سے بھی آگاہ کرتی ہے۔

اس کتاب کے ترجمہ میں ہم نے تحت اللفظی ترجمہ کی نسبت، کتاب کے مندرجات کے مفہوم کو بہتر انداز میں اردو میں منتقل کرنے کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ علماء طلباء اور دیگر شائقین علوم قرآن کے لئے یقیناً سودمند ہو گا۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا ترجمہ

کرتے وقت ہم نے اس امر کو پوری طرح مدنظر رکھا ہے کہ کتاب کا مفہوم اردو میں منتقل کرنے میں کوئی کسر اور نقص باقی نہ رہ جائے یا کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ لیکن انسانی کوشش میں غلطی اور خطا کے احتمال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر قارئین کو کسی مقام پر کوئی سقم نظر آئے یا اس کتاب کے آئندہ ایڈیشن کو مزید بہتر بنانے میں وہ کوئی رائے رکھتے ہوں۔ تو ہمیں ضرور مطلع کریں۔

والحمد للہ رب العالمین

سید نیاز محمد ہمدانی
بانی مجلس تعلیم القران
جعفریہ کالونی۔ بند روڈ
لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

محترم قارئین کی نظر سے گزرنے والی یہ کتاب دینِ مقدس اسلام کی بنیادی ترین سند سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں اس بات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ عالم اسلام میں قرآن مجید کا کیا مقام ہے؟ قرآن کیا ہے؟ اور مسلمانوں کے درمیان اسے کیا قدر و منزلت حاصل ہے؟ قرآن ایک عالمگیر اور ابدی کتاب ہے--- قرآن کسی انسان کی فکر کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ قرآن مجید کا مختلف علوم کے ساتھ کیا تعلق ہے اور یہ کہ قرآن مجید کے اوصاف کیا ہیں؟

درحقیقت ہم اس کتاب کے بارے میں بحث کر رہے ہیں جسکے معتبر، محترم اور مقدس ہونے میں کسی مسلمان کو کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اگرچہ دوسرے تمام بڑے مذاہب کی طرح دین اسلام بھی اندرونی اختلافات اور فرقہ بندیوں کا شکار ہوچکا ہے، مگر قرآن شریف کا یہ مقام اور احترام اپنی جگہ پر محفوظ ہے اور ہر دعوٰی کے اثبات کے لئے اس کا دامن تھاما جاسکتا ہے۔

اس لحاظ سے اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کے مقام کو اس طرح متعارف کرایا جائے جیسا کہ خود قرآن شریف اس پر دلالت کرتا ہے۔ نہ یہ کہ جس طرح ہم اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان دو باتوں اور مقاصد کے درمیان بہت فرق ہے۔

بالفاظ دیگر قرآن مجید کے جس مقام کو ہم دلیل کے ساتھ یا بغیر دلیل کے تسلیم کرتے ہیں، اگر وہ قرآنی بیانات کے مخالف اور متضاد ہو تو اس

کی کوئی قیمت نہیں ہوگی اور اگر وہ کوئی ایسی بات ہو جس کے بارے میں قرآن مجید خاموش ہے، تو مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافاتِ نظر کے پیش نظر سب کو اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ صرف اسی مقام کو تسلیم کیا جاسکتا ہے جس پر خود قرآن شریف دلالت کرتا ہو۔

بنا بریں ہم اس بحث میں اس سوال کا جواب تلاش کریں گے کہ "قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے"؟ اور اس سوال کا جواب تلاش نہیں کریں گے "ہم جو فلاں اسلامی مذہب کے پیرو ہیں قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہیں"۔

پہلا باب

قرآن مجید کو مسلمانوں کے درمیان کیا قدر و منزلت حاصل ہے؟

الف - قرآن مجید انسانی زندگی کے مکمل لائحہ عمل کے کلیات پر مشتمل ہے۔

ب - قرآن مجید سند نبوت ہے۔

الف - قرآن مجید انسانی زندگی کے مکمل لائحہ عمل کے کلیات پر مشتمل ہے۔

قرآن مجید انسانی زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہے۔اس لئے کہ اسلام جو کہ دیگر تمام مذاہب سے بہتر طور پر انسانی زندگی کی سعادت کی ضمانت دیتا ہے قرآن مجید کے ذریعے ہی مسلمانوں تک پہنچا ہے۔ اسلام کچھ اعتقادات اور عملی و اخلاقی قوانین کا مجموعہ ہے جن کا اصلی سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ ارشاد خداوندی ہے :-

اِنّ هٰذاالقرآن یهدی للتیؐ هی اقوم (اسری : ۹)

ترجمہ : بے شک یہ قرآن ایسے دین کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو دوسرے تمام مذاہبِ بشری سے بہتر انسانیت کے نظم و نسق کو چلاتا ہے۔

وَنَزّلنا عَلَیکَ اَلکِتَاب تِبیَاناً لِکُلِّ شَئیٍ (نحل : ۸۹)

ترجمہ : اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر شے کو بیان کرتی ہے۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں بنیادی دینی عقائد' اخلاقی فضائل اور عملی قوانین' بہت سی آیات میں مذکور ہوئے ہیں جن کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تفصیلی بیان :

مندرجہ ذیل نکات پر توجہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید واقعاً" انسانی زندگی کے لائحہ عمل پر مشتمل ہے :-

۱- انسان اپنی زندگی میں سعادت' خوش بختی اور لذت کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتا- (خوش بختی اور سعادت زندگی کی ایسی صورت کو کہتے ہیں جس کا انسان آرزو مند اور شیفتہ ہوتا ہے مثلاً" آزادی' فلاح اور وسعت معاش وغیرہ)

اگر کبھی کبھار زندگی میں ایسے افراد نظر آتے ہیں جو خوش بختی اور سعادت سے منہ پھیرے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً" وہ لوگ جو خود کشی کرلیتے ہیں یا زندگی کی لذتوں سے دست بردار ہو جاتے ہیں' اگر ان کی نفسیاتی کیفیت کا غور سے مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مخصوص اسباب کی بنا پر وہ اسی کو سعادت سمجھتے ہیں- مثال کے طور پر جو شخص خود کشی کرتا ہے وہ دکھوں اور ناہمواریوں کے نتیجہ میں موت کو ہی آرام و سکون کا راستہ سمجھتا ہے- اسی طرح جو شخص زہد و ریاضت کی راہ اپناتے ہوئے مادی لذتوں کو اپنے اوپر حرام کرلیتا ہے وہ اسی کو سعادت سمجھتا ہے-

پس انسان کی تمام دوڑ دھوپ کا مقصد سعادت اور کامیابی حاصل کرنا ہوتا ہے چاہے سعادت کی شناخت میں اس کا فیصلہ درست ہو یا غلط-

۲ - انسانی زندگی کی سرگرمیاں کسی لائحہ عمل کے بغیر ہرگز انجام نہیں پاسکتیں- یہ بات بالکل واضح ہے اور اگر کبھی مخفی ہوتی ہے تو اس کی وجہ بھی اسکا بہت زیادہ واضح ہونا ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو انسان اپنی خواہش اور ارادہ سے کام کرتا ہے- اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حالات کی روشنی میں جب تک وہ کسی کام کے قابل عمل ہونے کا علم حاصل نہ کرلے اسے انجام دینے کے لئے اقدام نہیں کرتا- دوسرے الفاظ میں وہ ہر کام کو "اندرونی علمی حکم" کے بعد انجام دیتا ہے- دوسری

طرف، وہ انہی کاموں کو انجام دیتا ہے جنہیں اپنے لئے، یعنی اپنی ضروریات کو برطرف کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے تمام کاموں میں براہ راست تعلق پایا جاتا ہے۔

کھانا پینا، سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، آنا جانا، وغیرہ میں سے ہر ایک، موقع و محل اور مقدار رکھتے ہیں۔ کبھی ضروری اور کبھی غیر ضروری، کبھی مفید اور کبھی مضر ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہر کام "اندورنی حکم" کے مطابق انجام پاتا ہے جس کے کلیات کا ذخیرہ انسان کے ادراک میں موجود ہے اور اس کی جزئیات موقع و محل کی مطابقت سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

ہر انسان اپنے کاموں میں ایک مملکت کی مانند ہے جس کے باشندوں کی سرگرمیاں مقررہ قوانین اور آداب و رسوم کے دائرے میں مقید ہوتی ہیں اور اس مملکت کی فعال قوتوں کا فرض ہے کہ پہلے اپنے تمام کاموں کو قانون کی روشنی میں پرکھ لیں اس کے بعد انہیں انجام دیں۔

کسی معاشرے کی اجتماعی سرگرمیاں بھی انفرادی سرگرمیوں کی مانند ہوتی ہیں اور ہمیشہ اکثریت کے تسلیم شدہ قوانین اور آداب و رسوم اس پر حاکم ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر بدنظمی اور آشفتگی کے نتیجہ میں تھوڑی سی مدت میں معاشرہ درہم برہم ہو جائے گا۔

اگر معاشرہ مذہبی معاشرہ ہو تو اس پر مذہبی احکام کی حکومت ہوگی اور اگر معاشرہ غیر مذہبی مگر متمدن ہو تو تمام سرگرمیاں قانون کے دائرے کے اندر انجام پائیں گی۔ اسی طرح اگر معاشرہ غیر مذہبی اور غیر متمدن ہو تو فردی حکومت اپنے وضع کردہ آداب و رسوم کو اس پر مسلط کردے گی یا پھر ان رسوم کو جو مختلف عقائد کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے وجود میں آتی ہیں، نافذ کردے گی۔

پس انسان اپنی فردی اور معاشرتی سرگرمیوں میں ہدف اور مقصد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور نہ ہی مناسب طریقوں اور مقررہ قوانین سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے اپنے مقصد کے حصول سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔

قرآن مجید بھی مذکورہ بالا نظریہ کی تائید کرتے ہوئے فرماتا ہے :

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ : ۱۴۸)

ترجمہ : اور ہر ایک کا ایک ہدف ہے جسے وہ سامنے رکھتا ہے پس کار ہائے خیر میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو۔ تاکہ اعلیٰ مقصد تک پہنچ جاؤ۔

بنیادی طور پر قرآن شریف میں دین کا اطلاق طرز زندگی پر ہوتا ہے۔ بنا بریں مومن اور کافر، حتیٰ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں، دین کے بغیر نہیں ہیں اس لئے کہ انسان کی زندگی کے امور آئین و قانون کے بغیر انجام ہی نہیں پاسکتے چاہے یہ قانون وحی و نبوت کی طرف سے ہو یا انسانوں کے باہمی عہد و پیمان کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کے بارے مین جو دین الٰہی کے دشمن ہیں، چاہے کسی بھی طبقہ سے ہوں، یوں فرماتا ہے :

اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (اعراف : ۴۵)

ترجمہ : وہ لوگ جو۔ لوگوں کو۔ اللہ کی راہ سے پھیر دیتے ہیں اور اللہ کی راہ۔ یعنی فطری طرز زندگی۔ کو مسخ کرکے اختیار کرتے ہیں۔ (۱)

۳ ۔ بہترین اور پائیدار ترین دین وہ ہے جس کی طرف انسان کی فطرت انسان کی رہنمائی کرتی ہے، نہ کہ وہ جو انسان یا معاشرہ کے جذبات کی بنیاد پر قائم ہو۔ کائنات کے جس بھی جزو کا غور سے مطالعہ کیا جائے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس کی خلقت کا کچھ مقصد ہے جس کی طرف وہ اپنی پیدائش کے دن سے متوجہ ہوتا ہے اور اس ہدف تک لیجانے والے مناسب ترین اور مختصر ترین راستے کو اختیار کرتا ہے۔ وہ اندرونی اور بیرونی طور پر ایسے وسائل سے لیس ہوتا ہے جو اس کے ہدف کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور مختلف قسم کی سرگرمیوں کا ذریعہ ہوتے

ہیں۔ فطرت کا یہ سلوک تمام جاندار اور بے جان موجودات کے ساتھ یکساں ہے۔

مثال کے طور پر گندم کا پودا اپنی خلقت کے پہلے روز جب زمین سے سر نکالتا ہے تو وہ گندم کے ایسے پودے کی پیدائش کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے جس کی کئی بالیں ہوں۔ وہ ان تمام صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے جن کی وجہ سے وہ زمین اور ہوا سے اپنے اجزائے عنصری ایک خاص نسبت سے جذب کر کے انہیں اپنے وجود کا حصہ بنالیتا ہے۔ وہ اپنی نشوونما جاری رکھتے ہوئے اپنی حالتیں بدلتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایسے پودے میں تبدیل ہو جاتا ہے جس میں کئی بالیں ہوتی ہیں اور پھر اسی مقام پر اپنا سفر ختم کردیتا ہے۔

اگر اخروٹ کے درخت کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ وہ بھی اپنی پیدائش کے پہلے ہی دن سے ایک خاص مقصد کی طرف حرکت کر رہا ہوتا ہے جو یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک تناور اور مضبوط درخت بن جائے۔ وہ اس مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کی مناسبت سے راستہ طے کرتا ہے اور اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے کبھی گندم کے پودے کا سفر اختیار نہیں کرتا۔چنانچہ گندم کا پودا بھی اپنے سفر میں اخروٹ کے درخت کا طریقہ کار اختیار نہیں کرتا۔

یہ قانون اس مادی کائنات کے تمام موجودات پر جاری ہوتا ہے اور اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ نوع انسان اس قانون سے مستثنیٰ ہو (کہ ہر نوع کا ایک ہدف ہوتا ہے اور اس کی سعادت اس ہدف کے حصول پر منحصر ہوتی ہے اور وہ اپنی وجودی صلاحیتوں سے مناسبت رکھنے والے راستے پر چلتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچتا ہے) انسان میں پائی جانے والی استعداد اور صلاحیتیں تو اس حقیقت پر ایک واضح دلیل ہیں کہ وہ بھی دیگر تمام مخلوقات کی مانند کوئی مقصد رکھتا ہے اور اس کی سعادت اس

مقصد کے حصول میں ہی مضمر ہے۔ علاوہ ازیں وہ بھی اپنی استعداد کی مناسبت سے اپنی سعادت کا معین راستہ رکھتا ہے۔

مذکورہ بیانات کی رو سے انسان کی مخصوص فطرت اور اسی طرح کائنات کی فطرت، کہ انسان جس کا جدائی ناپذیر جزو ہے، انسان کی حقیقی سعادت کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے اور اسے ایسے اہم اور پائیدار قوانین سے روشناس کراتی ہے جو اس کی سعادت کی ضمانت دیتے ہیں۔

مذکور بحث کی تائید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (طٰہٰ : ۵۰)

ترجمہ : ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مخصوص خلقت دی پھر اسے اس کی سعادت کی طرف ہدایت دی۔

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی (اعلیٰ : ۳)

ترجمہ : وہ ذات جس نے مخلوق کے اجزا کو جمع کر کے درست کیا، وہ خدا جس نے تقدیر بنائی اور ہدایت کی۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

ونفس وما سواھا فالھمھا فجورھا و تقواھا قد افلح من زکاھا و قد خاب من د ساھا (شمس : ۱۰)

ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے : قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے درست کیا پھر اسے بدکاری اور نیکوکاری سے آشنا کیا۔ جس نے اپنے نفس کو نشوونما دی وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے آلودہ اور تباہ کیا وہ ناامید ہوگیا

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (روم : ۳۰)

ترجمہ : اپنا چہرہ دین کے لئے استوار کردو۔ یعنی پوری توجہ سے دین کو قبول کرلو۔ اس حال میں کہ زیادتی اور کوتاہی سے پاک میانہ روی کی راہ اختیار کرو کہ یہی فطرت الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی وہ دین ہے جو انسان کی زندگی کو سنوارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا :

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران : ۱۹)

ترجمہ : اللہ کے ہاں دین اس کے ارادے کے سامنے جھک جانے کا نام ہے۔ یعنی اس فطرت کے سامنے جھک جانا جو انسان کو مخصوص قوانین کی طرف بلاتی ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا :

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران : ۸۵)

ترجمہ : جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کریگا اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا آیات اور اسی مضمون کی دوسری آیات کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سمیت اپنی تمام مخلوقات کو فطری طور پر سعادت اور مقصد خلقت کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ انسان کے لئے زندگی کا حقیقی راستہ وہی ہے جس کی طرف اس کی فطرت اسے بلاتی ہے او اس پر لازم ہے کہ اپنی فردی اور معاشرتی زندگی زندگی میں ایسے قوانین و ضوابط کی پابندی کرے جن کی طرف ایک فطری انسان کی طبیعت راہنمائی کرتی ہے البتہ وہ انسان ہرگز معیار نہیں ہیں جو ہوئی و ہوس سے آلودہ اور جذبات و خواہشات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

فطری دین کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی قوتیں ضائع نہ ہوں بلکہ ان میں سے ہر ایک کو عمل میں لایا جائے اسے جو مختلف اور متضاد قوتیں دی

گئی ہیں ان کے درمیان ایسا توازن قائم کیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک کو دوسری قوتوں سے ٹکرائے بغیر کام کرنے کی اجازت دی جائے۔

بہر حال انسان پر عقل کی حکمرانی ہونی چاہئے نہ کہ خواہشات نفسانی اور جذبات کی، چاہئے وہ عقل سلیم کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ معاشرے پر بھی حق اور معاشرے کے حقیقی مفادات کی حکومت ہونی چاہئے نہ کہ ایک مستبد شخص کی ہوا و ہوس کی اور نہ ہی اکثریت کی، چاہے وہ حق اور معاشرے کے حقیقی مفادات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور نتیجہ بھی حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو زیب نہیں دیتا کہ قانون بنائے یا لوگوں کے لئے فرائض مقرر کرے، اس لئے کہ جیسا کہ بیان ہوچکا ہے انسان کی زندگی کے لئے وہی قوانین مفید واقع ہوسکتے ہیں جو فطری طور پر اس کے لئے وضع کئے گئے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں اندرونی اور بیرونی اسباب و عوامل انسان سے ان کی انجام دہی کا تقاضا کریں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا اردہ کیا ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کا ارادہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس چیز کے انجام پانے کے اسباب و شرائط مہیا کردیئے ہیں۔ البتہ کبھی اسباب و شرائط ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اس چیز کے جبرا" وجود میں آنے کا تقاضا کرتے ہیں جیسا کہ روز مرہ کے طبیعی واقعات و حوادث میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کو ارادۂ تکوینی کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کبھی یہ اسباب و شرائط انسان سے تقاضا کرتے ہیں کہ اس عمل کو اپنے اختیار سے آزادانہ طور پر انجام دے مثلا" کھانا پینا وغیرہ۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کو ارادۂ تشریعی کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں متعدد مقامات پر فرمایا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف: ۴۰ اور ۶۷)

ترجمہ : حکم صرف اللہ کا ہے

ان مقدمات کے واضح ہو جانے کے بعد یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن شریف نے انہی حقائق کو مدنظر رکھے ہوئے کہ انسان اپنی زندگی میں ایک مقصد رکھتا ہے۔(جو کہ سعادتمندانہ زندگی ہے) جسے حاصل کرنے کے لئے وہ زندگی بھر کوشش اور جدوجہد کرتا ہے اور اس کی یہ تگ و دو صرف اسی صورت میں نتیجہ خیز ہوسکتی ہے جب وہ کسی لائحہ عمل کے مطابق ہو' ایسا لائحہ عمل جو کتاب فطرت سے حاصل کیا جائے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ تعلیم الہٰی سے سیکھا جائے۔ قرآن شریف نے انسان کی زندگی کا لائحہ عمل اس طرح مرتب کیا ہے کہ خدا شناسی کو اس کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اللہ کی وحدانیت پر ایمان کو دین کی اساس قرار دیا۔ خدا شناسی کے بعد معاد شناسی (قیامت کے روز پر ایمان' جس دن انسان کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا) کو اس کا نتیجہ قرار دیا۔ اس کے بعد پیغمبر شناسی کو معاد شناسی کا نتیجہ قرار دیا اس لئے کہ اچھے اور برے اعمال کا بدلہ صرف اسی صورت مین دیا جاسکتا ہے کہ پہلے نبوت اور وحی کے ذریعے اطاعت اور معصیت' اور نیکی و بدی کی پہچان کروادی جائے۔

اس طرح قرآن شریف نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت' نبوت اور قیامت پر ایمان کو اصول دین اسلام قرار دیا۔

اس کے بعد ان اصول دین سے مناسبت رکھنے والے اخلاق حمیدہ اور صفات حسنہ کے اصول بیان فرمائے۔ ایسے اخلاق و صفات جو ایک حقیقت پسند اور با ایمان انسان میں پائے جانے چاہئیں۔ بعد ازاں ایسے عملی قوانین بیان کئے جو انسان کی حقیقی سعادت کے محافظ اور اخلاق حمیدہ کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ ساتھ' بلکہ اس سے بڑھ کر' عقائد حقہ اور اصول اولیہ کی ترقی کا سبب بھی ہیں۔

اس لئے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص جنسی امور، چوری، خیانت، غبن اور لوگوں کی بے عزتی کرنے میں کسی قید و شرط کا پابند نہ ہو اور اس کے باوجود عفت و پاکدامنی کیساتھ متصف بھی ہو۔ یا جو شخص مال و دولت سمیٹنے کا رسیا ہو، لوگوں کی رقم جو اس کے ذمے ہے انہیں ادا نہ کرتا ہو اور اپنے مالی واجبات کو بھی ادا نہ کرتا ہو وہ سخاوت جیسی صفت کے ساتھ متصف ہو۔ یا یہ کہ جو شخص اللہ تعالٰی کی عبادت نہ کرتا ہو، اور ہفتوں بلکہ مہینوں اللہ کا ذکر نہیں کرتا خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور بندگی کے مقام پر فائز ہو سکتا ہو۔

پس اخلاق حمیدہ ہمیشہ کچھ مناسب اعمال کے ذریعے زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح اخلاق حسنہ کا بنیادی عقائد کے ساتھ بھی ایسا ہی تعلق ہے مثلاً" جو شخص غرور و تکبر اور خود پسندی کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہ ہو، اس سے اللہ تعالٰی پر ایمان اور بارگاہ ربوبیت میں خضوع کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ یا یہ کہ جس شخص نے عمر بھر انصاف و مروت، رحم و شفقت کا نام بھی نہ سنا ہو، اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ قیامت اور محاسبہ پر ایمان رکھتا ہو۔

اللہ تعالٰی عقائد حقہ اور اخلاق حسنہ۔ جو بجائے خود عقائد کی ایک قسم ہیں۔ کے باہمی تعلق کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر: ١٠)

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ پاکیزہ بات (عقیدہ) اللہ تعالٰی کی طرف بلند ہوتی ہے اور عمل صالح اسے بلند کرتا ہے، یعنی عمل صالح عقائد کے بلند ہونے میں مدد کرتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالٰی عمل اور عقائد کے باہمی ربط کے بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ اَسَاؤُا السُّوْاءَ اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا

يَسْتَهْزِئُونَ (روم : ۱۰)

ترجمہ : پھر برے کام کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مضحکہ اڑاتے تھے۔

مختصر یہ کہ قرآن شریف کی رو سے اسلام کے تین بنیادی اور کلی شعبوں کی ترتیب یہ ہے:

۱- اصول عقائد اسلامی' جن کی ایک قسم دین کے تین بنیادی اصول یعنی توحید' نبوت اور قیامت ہیں جبکہ بعض عقائد کو ان کی فرع کی حیثیت حاصل ہے مثلاً" لوح و قلم' قضا و قدر' ملائکہ' عرش و کرسی اور خلقت زمین و آسمان جیسے عقائد۔

۲ - اخلاق حسنہ۔

۳ - شرعی احکام اور عملی قوانین' جن کے کلی اصول قرآن شریف نے بیان کئے ہیں جبکہ انکی تفصیلات اور جزئیات کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کیا گیا ہے اور حدیث ثقلین کی رو سے' جسے مسلمانوں کے تمام فرقوں نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیانِ احکام میں اپنے اہلِ بیت کو اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے(۲)

ب - قرآنِ مجید سندِ نبوت ہے

قرآنِ مجید کئی مقامات پر اپنے کلام اللہ ہونے کی تصریح کرتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ انہی الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسے ان ہی الفاظ میں دریافت فرمایا۔ قرآن شریف کے کلام اللہ ہونے اور کلام بشر نہ ہونے کے اثبات کے لئے اس کی آیات کریمہ نے منکرین کو مقابلہ کی دعوت دیتے ہوئے قرآن شریف کو ہر لحاظ سے معجزہ اور انسانی طاقت سے بالاتر قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَا يُؤْمِنُوْنَ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ اِنْ كَانُوْا صَادِقِيْنَ (طور : ۳۴)

ترجمہ : یا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کا کلام ہے، بلکہ یہ ایمان نہیں لاتے، پس اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا کلام لے آئیں۔ (یعنی بنا لائیں)

مزید فرماتا ہے :

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (اسریٰ : ۸۸)

ترجمہ : اے محمدؐ۔ کہہ دیجئے کہ اگر جن اور انسان اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو نہیں لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے :

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ (ھود : ۱۳)

ترجمہ : یا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ اس کی افترا پردازی ہے، پس تم بھی افترا پردازی پر مبنی اس جیسی دس سورتیں لے آؤ۔

ایک اور جگہ پر فرمایا :

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ (یونس : ۳۸)

ترجمہ : یا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ اس کی افترا پردازی ہے پس تم بھی افترا پردازی پر مبنی اس جیسی ایک سورۃ لے آؤ۔

ایک اور مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے حوالے سے فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (بقرہ : ۲۳)

ترجمہ : اور اگر تم اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے

شک میں ہو تو اس جیسے ایک شخص سے۔ جس نے جاہلیت کے ماحول میں نشوونما پائی ہو اور لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو۔ ایک سورۃ لے آوَ۔

اس کے علاوہ قرآن شریف میں اختلاف نہ ہونے کے حوالے سے دعوت مقابلہ دیتے ہوئے فرمایا:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (نسا : ۸۲)

ترجمہ : آیا یہ لوگ قرآن شریف میں تدبر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو یہ ضرور اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

اس لئے کہ کائنات کی ہر چیز تغیر اور تکامل کے قانون کے تابع ہے اور اس کے اجزا و احوال تضاد سے خالی نہیں ہوسکتے۔ لہذا اگر قرآن شریف انسان کا کام ہوتا جو کہ تئیس برسوں میں بتدریج انجام پایا ہے تو اوصاف و احوال کے اختلاف سے محفوظ نہ ہوتا اور اس میں ہماہنگی نہ ہوتی۔

قرآن شریف جو ان دلائل سے اپنے کلام اللہ ہونے کو پایہ ثبوت تک پہنچاتا ہے، شروع سے آخر تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر قرار دیتا ہے۔ اس طرح قرآن شریف آنحضرت کی نبوت کی سند کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ اپنی نبوت کے اثبات کے لئے اللہ تعالیٰ کی گواہی یعنی قرآن شریف کی تصریحات کو دلیل قرار دیں۔

قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ (رعد : ۴۳)

ترجمہ : کہہ دیجئے تمہارے اور میرے درمیان--- میری نبوت پر---- اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کے ساتھ فرشتوں کی گواہی کو

بھی نقل کیا گیا ہے:

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْھَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَشْھَدُوْنَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا (نسا: ٦٦)

ترجمہ: لیکن اللہ تعالیٰ اس کی گواہی دیتا ہے جو اس نے آپ پر نازل کیا، اس نے اپنے علم سے نازل کیا اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بحیثیت گواہ کافی ہے۔

حواشی

۱۔ آیت کی دلالت اس طرح سے ہے کہ قرآن شریف میں سبیل اللہ سے مراد دین ہے اور آیہ شریفہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ظالم لوگ حتی کہ جو خدا کے منکر ہیں دین خدا (دین فطرت) کو تحریف کرکے اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا جو لائحہ عمل وہ اپنی زندگی میں اختیار کرتے ہیں وہی انکا دین ہے۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ بعض موضوعات سے متعلق قرآن شریف نے صرف کلی اصول بیان کئے ہیں لیکن یہ سمجھ لینا بھی درست نہیں ہے کہ قرآن شریف نے کسی قسم کی جزئیات کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ عام طور پر دینی حلقوں میں یہ مشہور ہے کہ آیات احکام کی تعداد قرآن شریف میں پانچ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن قرآن شریف کا غور سے مطالعہ کرنی سے یہ بات بھی غلط نظر آنے لگتی ہے بلکہ آیات احکام کی تعداد دو ہزار سے بھی زیادہ ہے جن میں بہت سی جزئیات کا بھی ذکر ہے (مترجم)

۳۔ عبقات الانوار کی حدیث ثقلین کی جلد ملاحظہ ہو۔ اس کتاب میں مذکورہ حدیث کو شیعہ و سنی کی سینکڑوں اسناد کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

دوسرا باب

اس باب میں مندرجہ ذیل عناوین پر روشنی ڈالی جائے گی:

☆ قرآن مجید ایک عالمگیر کتاب ہے۔
☆ قرآن مجید ایک مکمل کتاب ہے۔
☆ قرآن مجید ایک ابدی کتاب ہے۔
☆ قرآن مجید اپنی دلالت میں مستقل ہے۔
☆ قرآن مجید ظاہر و باطن رکھتا ہے۔
☆ قرآن مجید ظاہر و باطن کے ذریعے کیوں بات کرتا ہے؟
☆ قرآن مجید میں محکم اور متشابہ موجود ہیں۔
☆ مفسرین کی نظریں محکم اور متشابہ کے معنی۔
☆ محکم اور متشابہ کے بارے میں آئمہ اہل بیت کا طریقہ۔
☆ قرآن مجید تاویل اور تنزیل رکھتا ہے۔
☆ علما اور مفسرین کی نظر میں تاویل کے معنی۔
☆ قرآن مجید کی روشنی میں تاویل کے حقیقی معنی کیا ہیں؟
☆ قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ پائے جاتے ہیں۔
☆ قرآنی مفاہیم کی مصادیق پر تطبیق۔
☆ تفسیر قرآن' اس کا آغاز اور سفر۔
☆ علم تفسیر اور طبقات مفسرین۔
☆ شیعہ مفسرین کا طریقہ اور ان کے طبقات۔
☆ قرآن شریف کس طرح تفسیر کو قبول کرتا ہے۔
☆ نتیجہ بحث۔
☆ قرآن مجید کی رو سے قرآن مجید کی تفسیر کا ایک نمونہ۔
☆ رسول اللہ اور آئمہ علیہم السلام کے بیان کے حجت ہونے

کے معنی۔

☆ قرآن مجید ایک عالمگیر کتاب ہے

قرآن شریف کے مفاہیم کسی قوم مثلاً" عربوں یا مسلمانوں کے ساتھ مختص نہیں ہیں۔بلکہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی اسی طرح گفتگو کرتا ہے جس طرح مسلمانوں کے ساتھ۔ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل وہ خطابات ہیں جن میں قرآن شریف کفار، مشرکین، اھل کتاب، یہود، بنی اسرائیل اور نصاریٰ کو مخاطب کرکے ان پر حجت تمام کرتے ہوئے انہیں اپنے معارفِ حقہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ان تمام مذاہب کے ماننے والوں سے خطاب کرتے ہوئے قرآن شریف ان کے عرب ہونے کی شرط نہیں لگاتا چنانچہ مشرکین یعنی بت پرستوں کے بارے میں فرماتا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ

ترجمہ : پس اگر یہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ (توبہ : ۱۱)

اھل کتاب۔ یہود و نصاریٰ اور مجوس جو کہ اہل کتاب میں سے ہیں، کے بارے میں فرمایا:

قُلْ یَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَنْ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئاً وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً" اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (آل عمران : ۶۴)

ترجمہ : کہہ دیجئے اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے علاوہ ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں۔

ان آیات میں یہ نہیں کہا گیا کہ اگر عرب مشرکین توبہ کرلیں..... اور

یہ بھی نہیں فرمایا کہ:

اے عربی نسل سے تعلق رکھنے والے اہل کتاب.......

طلوع اسلام کے آغاز میں چونکہ اسلام کی دعوت جزیرۃ العرب کے اندر ہی محدود تھی لہٰذا قدرتی سی بات ہے کہ قرآنی خطابات عربوں پر ہی پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن ہجرت کے چھٹے سال سے جب اسلام کا پیغام جزیرۃ العرب سے باہر پہنچا تو اس وقت اس کے کسی خاص قوم کے ساتھ مختص ہونے کے وہم و گمان کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ ان آیات کے علاوہ بعض دوسری آیات بھی قرآنی دعوت کے عام ہونے پر دلالت کرتی ہیں مثلاً":

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (انعام : ۱۹)

ترجمہ : اور مجھ پر یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس تک یہ پہنچے، ڈراؤں۔

قرآن شریف کی یہ آیات :

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (قلم : ۵۲)

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (ص : ۸۷)

ترجمہ : یہ (قرآن) تمام جہانوں کے لئے یاد آوری ہے۔

اسی طرح یہ آیہ شریفہ :

اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ نَذِیْرًا لِّلْبَشَرِ (مدثر : ۳۶)

ترجمہ : بے شک یہ بہت بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے جو انسان کے لئے ڈرانے والی ہے۔

تاریخی اعتبار سے بھی مختلف مذاہب مثلاً" مشرکین، یہود اور نصاریٰ کے پیروکاروں اور مختلف اقوام کے افراد کا مسلمان ہونا ثابت ہو چکا ہے مثلاً" سلمان فارسی، صہیب رومی اور بلال حبشی۔

☆ قرآن ایک مکمل کتاب ہے

قرآن شریف انسانیت کے ایک مکمل مقصد پر مشتمل ہے اور اسے مکمل ترین انداز سے بیان کرتا ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کا مبنی بر حقیقت مقصد ایک مکمل آفاقی نظریے اور اس سے ہم آہنگ اخلاقی اصول اور عملی قوانین کی پابندی سے عبارت ہے۔ قرآن مجید اسی مقصد کی مکمل تشریح کو بیان فرماتا ہے۔

قرآن شریف کے بارے میں خداوند متعال کا ارشاد ہے:

یَهْدِیْ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ (احقاف : ۳۰)

ترجمہ : عقائد میں یہ حق کی طرف اور عمل میں۔ سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر تورات و انجیل کے ذکر کے بعد فرمایا:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ (مائدہ : ۴۸)

ترجمہ : اور ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی جو اپنے سامنے والی (آسمانی کتب) کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر محیط اور نگہبان ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن شریف کے گزشتہ انبیاء کی شریعتوں پر مشتمل ہونے کے بارے میں فرمایا:

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰٓی (شوریٰ : ۱۳)

ترجمہ : ہم نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کی ہم نے نوح کو وصیت کی اور جو ہم نے آپ پر وحی کی اور جس کی ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی۔

ایک جامع بیان میں اس طرح ارشاد فرمایا:

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (نحل : ۸۹)

ترجمہ : اور ہم نے آپ پر بتدریج کتاب نازل کی جو ہر شے کو بیان کرنے والی ہے۔

مندرجہ بالا آیات کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن شریف اضافات کے ساتھ تمام آسمانی کتب کے مقاصد کی حقیقت پر مشتمل ہے۔ سعادت اور خوش بختی کی راہ پر چلنے کے لئے انسان جن عقائد و اعمال کا محتاج ہے وہ سب اس کتاب میں مکمل طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

☆ قرآن مجید ایک ابدی کتاب ہے

اس مدعا کے اثبات کے لئے گزشتہ فصل کے مطالب کافی ہیں، اس لئے کہ جب کسی مقصد سے متعلق کوئی بات بطور مطلق و کامل بیان کی جائے تو اس کا صحیح و معتبر ہونا کسی خاص مدت یا زمانے کے ساتھ مختص نہ ہوگا قرآن مجید اپنے بیانات کو کامل قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ کمال سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے۔ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ (طارق : ۱۴)

ترجمہ : قرآن حق و باطل کے درمیان قول فاصل ہے اور بیہودہ گوئی نہیں ہے۔

اسی طرح اعتقادی معارف خالص حقیقت ہیں اور جو اخلاقی اصول اور عملی قوانین بیان کئے گئے ہیں وہ انہی خالص اور اٹل حقائق کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو قابل بطلان اور وقت گزرنے کے ساتھ قابل نسخ نہیں ہوتیں۔ خداوند کریم کا ارشاد ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (اسریٰ : ۱۰۵)

ترجمہ : اور ہم نے اسے حق کے ساتھ نازل کیا اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا۔

یعنی قرآن شریف اپنے حدوث اور بقا میں حق سے جدا نہیں ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالِ (یونس : ۳۲)

ترجمہ : پس حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہوتا ہے؟

یعنی جب تم حق سے گزر جاؤ تو پھر گمراہی کے سوا کچھ باقی نہیں بچتا۔

ایک اور مقام پر جامع انداز میں فرمایا:

اِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حم سجدہ : ۴۲)

ترجمہ : بے شک یہ ایک عزیز (تعدی کرنے والے عناصر کو غلبے کے ساتھ دور کر دینے والی) کتاب ہے جس کی طرف آگے اور پیچھے سے باطل نہیں آسکتا۔ (یعنی نہ اب قابل نسخ و بطلان ہے اور نہ آئندہ ہوگی)۔

البتہ قرآنی احکام کے ابدی ہونے کے بارے میں بہت بحث کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے لیکن یہ بحث اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے اور وہ موضوع ہے "قرآن کا مقام قرآن کی دلالت کی روشنی میں"۔

☆ قرآن مجید اپنی دلالت میں مستقل ہے

قرآن مجید جو کہ صنف کلام میں سے ہے کلام کی دوسری تمام صورتوں کی مانند اپنے مطلوبہ معانی کو آشکار کرتا ہے اور اپنی دلالت میں ہرگز گونگا نہیں ہے، نہ ہی ہمارے پاس کوئی ایسی خارجی دلیل ہے جو یہ ثابت کرے کہ قرآنی الفاظ کی مراد ان مفاہیم سے مختلف ہے جو اس کے عربی الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں۔

قرآن مجید اپنی دلالت میں گونگا نہیں ہے، اس لئے کہ جو شخص بھی لغت سے آشنائی رکھتا ہے آیات کریمہ سے ان کے معانی اسی طرح سمجھتا ہے جس طرح عربی زبان کے کسی بھی کلام کے جملات کے معانی سمجھ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن شریف میں ہمیں بہت سی ایسی آیات بھی ملتی

ہیں جن میں کسی خاص قوم مثلاً" بنی اسرائیل، مومنین، کفار اور بعض مقامات پر عامتہ الناس کو مخاطب کرکے اپنے مقاصد پیش کئے گئے ہیں، ان پر حجت تمام کی گئی ہے یا انہیں مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے کہ اگر قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں انہیں کسی قسم کا شک و شبہ ہو تو اس کی مانند کلام بنا کر لے آئیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ لوگوں سے ایسے الفاظ میں گفتگو کرنا جن کے مفاہیم نا قابل فہم ہوں ایک بے معنی سی بات ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک غیر معمولی سی بات ہے کہ لوگوں کو ایسا کلام بنا کر لانے کا حکم دیا جائے جس سے کوئی معنی نہ سمجھے جاتے ہوں۔

اس کے علاوہ خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلیٰ قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد : ۲۴)

ترجمہ : کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا یہ کہ ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافاً" کثیرا" (نسا : ۸۲)

ترجمہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔

یہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن شریف میں تدبر ہو سکتا ہے اور تدبر کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے فہم اور سمجھ حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ تدبر، قرآنی آیات کے ان اختلافات کو حل کردیتا ہے جو سطحی نظر میں رونما ہوتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر قرآنی آیات کے معانی ظاہر نہ ہوتے تو ان میں تفکر و تدبر کے ذریعے بظاہر نظر آنے والے اختلاف کا حل ہونا ایک بے معنی سی بات ہوتی۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ظواہر قرآن کے حجت نہ ہونے پر

کوئی خارجی دلیل نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی کوئی دلیل موجود ہی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ بعض کا کہنا ہے کہ قرآن شریف کے معانی سمجھنے کے لئے رسول اللہ اور ان کے اھل بیت سلام اللہ علیھم اجمعین کے ارشادات کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

لیکن یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ سلام اللہ علیھم اجمعین کے ارشادات کا حجت ہونا قرآن شریف سے ہی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ دلالت قرآن کا حجت ہونا ان کے بیان پر موقوف ہو جب کہ اصل رسالت و امامت کے اثبات کے لئے ہمیں قرآن مجید کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے جو کہ سند نبوت ہے۔

البتہ یہ بات اس حقیقت سے منافات نہیں رکھتی کہ رسول اللہ اور آئمہ سلام اللہ علیھم اجمعین احکام شرعی کی ان تفصیلات کو بیان کرنے کے ذمہ دار ہیں جو ظواہر قرآن سے ہمارے ہاتھ نہیں آتی ہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنی معارف کے معلم کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات مندرجہ ذیل آیات سے ثابت ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِم (نحل : ۴۴)

ترجمہ : اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لئے بیان کریں جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔

وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (حشر : ۷)

ترجمہ : اور جو رسول تمہیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

معنی یہ ہیں کہ جس چیز کا حکم دیں اسے بجا لاؤ اور جس بات سے منع کریں اس سے باز آجاؤ۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (نساء : ۶۴)

ترجمہ : اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (جمعہ : ۲)

ترجمہ : وہی ہے جس نے امی لوگوں میں سے انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شریعت کی تفصیلات اور جزئیات کے بیان کرنے والے اور قرآن شریف کے الٰہی معلم ہیں۔ جبکہ حدیث ثقلین جو کہ متواتر ہے، اس کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ بالا امور میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے۔ یہ بات اس حقیقت سے منافات نہیں رکھتی کہ دوسرے لوگ بھی ان حقیقی معلمین قرآن سے سیکھے ہوئے طریقوں پر عمل کرتے ہوئے آیات قرآن کے ظواہر سے قرآن مجید کے معانی سمجھ سکیں۔

☆ قرآن مجید ظاہر و باطن رکھتا ہے:

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا (نساء : ۳۶)

ترجمہ : اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو بھی۔ اس کی عبادت میں شریک نہ کرو۔

ظاہری طور پر یہ آیہ شریفہ بت پرستی کی ممانعت کر رہی ہے جیسا کہ ایک اور مقام ارشاد الٰہی ہے:

وَاجْتَنِبُوْا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (حج : ۳۰)

ترجمہ : اور ناپاکی سے اجتناب کرو جو کہ بت ہیں۔

لیکن تفکر اور تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستی اس لئے ممنوع ہے کہ یہ غیر اللہ کے سامنے عاجزی اور فروتنی ہے' بت کے معبود ہونے کو اس میں کوئی دخل حاصل نہیں ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کی پیروی کو اس کی عبادت قرار دیا ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ (یس : ۶۰)

ترجمہ : کیا میں نے تمہیں حکم نہیں دیا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

ایک اور تحلیل سے یہ بات بھی آشکار ہوجاتی ہے کہ اطاعت کے سلسلے میں اپنی اور دوسروں کی اطاعت میں کوئی فرق نہیں ہے' جس طرح انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں دوسروں کی اطاعت کرے اسی طرح اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔ لہٰذا خداوند کریم کا فرمان ہے:

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (جاثیہ : ۲۳)

ترجمہ : کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی ہوائے نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی اس سے غافل ہونا چاہئے' اس لئے کہ غیر اللہ کی طرف توجہ کرنے کا مطلب اسے مستقل قرار دینا اور اس کے سامنے عجز اور پستی کا اظہار کرنا ہے۔ یہی ایمان' عبادت و بندگی کی روح ہے۔ خداوند متعال کا ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ..... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (اعراف : ۱۷۹)

ترجمہ : بے شک ہم نے جن و انس کی اکثریت کو جہنم کے لئے پیدا کیا...... یہی لوگ۔ اللہ تعالیٰ سے غافل ہیں۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، آیہ کریمہ **ولا تشرکوا بہ شیاء"** سے ابتدا" یہ سمجھا جاتا ہے کہ بت پرستی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن حد نظر کو وسیع کرلیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی اور کی اطاعت نہیں کرنی چاہئے۔ دائرہ نظر ذرا اور وسیع ہو جائے تو اپنی خواہشات کی پیروی بھی ممنوع ہو جاتی ہے۔ حد نگاہ کو مزید وسیع کرلیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے غفلت اور غیر اللہ کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔

قرآن شریف میں اول سے آخر تک یہی ترتیب جاری و ساری ہے۔ یعنی آیت سے ابتداء" ایک سادہ مفہوم سامنے آتا ہے، اس کے بعد ایک وسیع تر مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد اس سے بھی زیادہ وسیع مفہوم چہرہ نمائی کرتا ہے۔ ان معانی میں غور و فکر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول معروف حدیث جو کتب حدیث و تفسیر میں مذکور ہے، کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ حدیث یہ ہے:

ان للقران ظهرا" و بطنا ولبطنہ بطنا" الی سبعتہ ابطن

ترجمہ : قرآن شریف کا ظاہر اور باطن ہے اور اس کے باطن کا بھی باطن ہے سات بطون تک (۲)

گزشتہ بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن ظاہر و باطن (یا ظہر و بطن رکھتا) ہے اور دونوں مراد ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں ھماھنگی پائی جاتی ہے تضاد نہیں، ظاہری معنی باطنی معنی کی نفی نہیں کرتے، نہ ہی باطنی معنی ظاہری معنی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

☆ قرآن مجید ظاہر و باطن کے ذریعے کیوں بات کرتا ہے؟

۱۔انسان اپنی عارضی دنیوی زندگی میں ایک بلبلے کی مانند اپنے وجود کا

خیمہ مادے کے ایک بحر بیکراں پر نصب کرتا ہے اور اپنے تمام کاموں اور سرگرمیوں میں مادے کی طوفانی لہروں سے روبرو رہتا ہے۔ اس کے اندرونی و بیرونی حواس، مادہ اور مادیات میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے افکار بھی اس کی حسی معلومات کے پابند ہوتے ہیں۔ اس کے تمام کام، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، بولنا سننا، آنا جانا اور تمام حرکات و سکنات کا تعلق اسی مادی دنیا سے ہوتا ہے اور ان کے علاوہ وہ کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتا۔

اگر کبھی وہ بعض معنوی امور مثلاً" دوستی و دشمنی، بلند ہمتی اور بزرگی، مقام وغیرہ کا تصور کرتا ہے تو ان کے سمجھنے کے لئے بھی مادی مصادیق کو مدنظر رکھتا ہے مثلاً" وہ فتح کی شیرینی کو شکر کی مٹھاس، دوستی کی کشش کو مقناطیس کی کشش، بلند ہمتی کو کسی جگہ یا ستاروں کی بلندی اور مقام کی بزرگی و عظمت کو پہاڑ کی عظمت وغیرہ سے بیان کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معنویات کے دریافت کرنے اور سمجھنے میں تمام افراد کی توانائی اور صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتی ہیں اس لئے کہ معنویات کی دنیا مادی دنیا سے وسیع تر اور مختلف ہوتی ہے اور ان کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ معنویات کے بارے میں بعض لوگوں کا تصور صفر کے برابر ہوتا ہے۔ بعض کی استعداد اس سے بالاتر ہوتی ہے اور یہ سلسلہ وہاں تک جا پہنچتا ہے جہاں انسان بہت آسانی سے وسیع ترین معنویات کو دریافت کرسکتا ہے۔

بہر حال جس قدر معنویات کو دریافت کرنے کی استعداد زیادہ ہوگی اسی تناسب سے مادی دنیا اور اس کے پر فریب مظاہر سے تعلق کم ہوگا، جس قدر یہ تعلق کم ہوگا اسی تناسب سے معنویات تک رسائی کی استعداد زیادہ ہوگی۔ اس کے باوجود انسانی طبیعت کی اساس پر تمام انسانوں میں یہ استعداد موجود ہے اور اگر وہ اس استعداد کو ضائع نہ کریں تو ان کی

تربیت امکان پذیر ہے۔

۲ ۔ گزشتہ بیان سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ فہم و ادراک کے مختلف مراتب میں سے ہر مرتبہ کی معلومات اس سے نیچے کے مرتبہ پر مسلط نہیں کی جاسکتی ہیں ورنہ اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوگا، خصوصاً" ایسے معنوی امور جو مادہ اور جسم کی سطح سے بہت زیادہ بلند ہوں اگر انہیں کھلے الفاظ میں عوام پر مسلط کیا جائے جو کہ حس کے دائرے سے باہر نہیں آسکتے تو اس سے مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

یہاں پر نمونے کے طور پر مذہب بت پرستی کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہندی ویدوں میں سے اپانیشاد کے حصے کا غور سے مطالعہ کرے اور اس حصے کی باتوں کا ایک دوسرے کی روشنی میں جائزہ لے تو اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس حصے کا توحید کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے لیکن، بدقسمتی سے، چونکہ اسے واضح اور کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے لہٰذا جب اسے عوام کی ذہنی سطح پر نافذ کیا جاتا ہے تو اس سے سوائے بت پرستی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پس ضروری ہے کہ ماورائے طبیعت حقائق کو مادیات میں جکڑے ہوئے انسانوں کے لئے بہر صورت پردوں میں بیان کیا جائے۔

۳ ۔ اگرچہ دوسرے مذاہب میں بعض انسانوں کو مذہبی اعزاز سے محروم رکھا گیا ہے مثلاً" برہمنی، کلیمی اور مسیحی مذہب میں عورتیں مذہبی اعزاز سے محروم ہیں یا یہ کہ بت پرستی اور عیسائیت میں مقدس کتابوں کے دروازے عوام پر بند ہیں لیکن اسلام میں اس سلسلے میں کسی کے خلاف کسی قسم کا کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا گیا ہے۔ ہر مرد عورت، کالے گورے اور عوام و خواص، سب پر اعلیٰ مذہبی مقام حاصل کرنے کے دروازے کھلے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ

(آل عمران : ۱۹۵)

ترجمہ : میں تم میں سے کسی مرد یا عورت، عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ تم ایک دوسرے میں سے --- یعنی ایک نوع --- سے ہو۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَ اُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاكُمْ (حجرات : ۱۳)

ترجمہ : اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں قرار دیا بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ قرآن شریف نے اپنی تعلیمات میں تمام انسانیت کو مدنظر رکھا ہے یعنی اس نے ہر انسان کو انسان ہونے کے ناطے تربیت اور تکمیل کے قابل سمجھتے ہوئے اپنی تعلیمات کو پوری دنیائے انسانیت پر پھیلا دیا ہے۔ دوسری طرف سے چونکہ معنویات تک رسائی حاصل کرنے میں افراد کی صلاحیتیں یکساں نہیں ہیں---- اور جیسا کہ معلوم ہوچکا ہے کہ اعلیٰ پائے کے حقائق کو آشکارا بیان کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے---- لہٰذا قرآن شریف نے اپنی تعلیمات کو عام انسان کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے سادہ زبان میں بیان کیا ہے۔

اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اعلیٰ پائے کے معنوی حقائق سادہ زبان میں بیان کئے جائیں۔ الفاظ ظاہری اور محسوس مطالب کو بیان کریں جبکہ معنویات پس پردہ پوشیدہ ہو کر افراد کی استعداد کے مطابق جلوہ گر ہوں اور ہر انسان اپنی حالت کے اعتبار سے ان سے بہرہ مند ہو۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ وَاِنَّهٗ فِيْ اُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا

لَعَلِيٌّ حَكِيْم (زخرف : ۴)

ترجمہ : بے شک ہم نے اسے عربی- پڑھا جانے والا- قرآن قرار دیا تاکہ ہوسکتا ہے تم عقل سے کام لو اور بے شک وہ ہمارے پاس ام الکتاب میں بلند مرتبہ (جس تک انسانی فہم کی رسائی ممکن نہیں) اور محکم ہے (یعنی افہام اس میں رخنہ اندازی نہیں کرسکتیں)

اسی طرح حق و باطل اور افہام کی وسعتوں کو بیان کرنے کے لئے ایک مثال بیان فرمائی:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا (رعد : ۱۷)

ترجمہ : اس نے آسمان سے پانی نازل کیا پھر وہ وادیوں کی گنجائش کے مطابق ان میں بہنے لگا۔

ایک مشہور حدیث(۳) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

انا معاشر الانبیاء نکلم الناس علی قدر عقولهم

ترجمہ : ہم انبیاء لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرتے ہیں۔

اس روش سے ایک اور نتیجہ جو ہمارے ہاتھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآنی بیانات اپنے باطنی مفاہیم کی نسبت مثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ معارف الہیہ جو معمولی افہام کی سطح سے بہت بلند ہیں، قرآنی بیانات ان کی نسبت امثال کی مانند ہیں جن کا مقصد ان معارف کو ان افہام سے قریب تر کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا" (اسریٰ : ۸۹)

ترجمہ : اور بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کی امثال پھیر پھیر کر بیان کی ہیں لیکن اکثر لوگوں نے انکار کیا اور صرف کفر کا ارتکاب کیا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنلس وما یعقلها الا العالمون
(عنکبوت : ۸۹)

ترجمہ : اور ہم یہ امثال لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں اور انہیں اہل علم کے علاوہ کوئی نہیں سمجھتا۔

قرآن مجید نے بہت سی امثال بیان کی ہیں مگر مندرجہ بالا آیات اور اس مضمون کی دیگر آیات مطلق ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام قرآنی بیانات معارف عالیہ، جو کہ قرآن شریف کے حقیقی مقاصد ہیں، کی نسبت امثال ہیں۔

☆ قرآن مجید میں محکم اور متشابہ موجود ہیں

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ (ھود : ۱)

ترجمہ : یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئی ہیں۔

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ (زمر : ۲۳)

ترجمہ : اللہ نے بہترین بات نازل کی، کتاب جس کی آیات ایک دوسرے سے شباہت رکھتی ہیں، اور دو دو ہیں، اس سے ان لوگوں کی کھال لرز اٹھتی ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوْنَ

فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا (آل عمران : ۷)

ترجمہ : وہی تو ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیات محکم ہیں جو کتاب کی اصل (اور اس کا محور) ہیں اور بعض متشابہ ہیں' جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی اتباع کرتے ہیں' وہ فتنہ گری اور اس کی تاویل چاہتے ہیں حالانکہ اس کی تاویل کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ (آیات متشابہات کے بارے میں) کہتے ہیں ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں' سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔

جیسا کہ واضح ہے' مذکورہ بالا تین آیات میں سے پہلی آیت پورے قرآن شریف کو محکم قرار دے رہی ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ یہ کتاب نا قابل خلل اور نا قابل بطلان ہے۔ دوسری آیت پورے قرآن شریف کو متشابہ قرار دے رہی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن شریف کی تمام آیات' اپنی خوبصورتی' اسلوب' لہجے کی شیرینی اور غیر معمولی تاثیر کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ یہ خصوصیات پورے قرآن شریف میں پائی جاتی ہیں۔

تیسری آیت' جو اس فصل میں ہمارا موضوع بحث ہے' قرآن شریف کو محکم اور متشابہ میں تقسیم کرتی ہے۔ اس آیت سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ:

(الف) آیات محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا مفہوم محکم اور استوار ہو' ان کے مطلوبہ معانی غیر مطلوبہ معانی سے شباہت نہ رکھتے ہوں اور اس بارے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ پایا جاتا ہو جبکہ آیات متشابہات اس کے برعکس ہیں۔

(ب) ہر راسخ الایمان مومن کا فرض ہے کہ آیات محکمات پر ایمان لائے اور عمل کرے اور آیات متشابہات پر ایمان لائے مگر ان پر عمل

کرنے میں توقف کرے اس لئے صرف ٹیڑھے دلوں والے کج فکر افراد ہی لوگوں کو دھوکہ دینے اور تاویل میں دست اندازی کرنے کی غرض سے آیات متشابہات پر عمل کرتے ہیں۔

☆ محکم اور متشابہ کے معنی علما اور مفسرین کی نظر میں

محکم اور متشابہ کے معانی سے متعلق علمائے اسلام میں عجیب اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اقوال و آراء کی جستجو میں اس مسئلہ سے متعلق تقریباً" بیس اقوال مل جاتے ہیں۔

آغاز اسلام سے اب تک جو نظریہ عملی طور پر مفسرین کے درمیان قابل اعتماد رہا ہے وہ یہ ہے کہ آیات محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے مطلوبہ معانی واضح ہیں اور غیر مطلوبہ معانی سے مشتبہ نہیں ہوتے۔ اس قسم کی آیات پر ایمان لانے کے ساتھ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے برعکس آیات متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظاہری معانی مراد نہیں ہیں بلکہ ان کے مطلوبہ معانی جو کہ اس کی تاویلات ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور انسان کو ان تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ اس قسم کی آیات پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن ان پر عمل سے اجتناب کرنا چاہئے۔

یہ قول علماء اہل سنت والجماعت کے درمیان مشہور ہے۔ اس قول کو شیعہ علماء کے درمیان بھی شہرت حاصل ہے مگر فرق صرف یہ ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ اور آئمہ اہل بیت علیھم السلام بھی تاویل کا علم رکھتے ہیں لیکن عام مومنین جو تاویل متشابہات کا علم نہیں رکھتے ان پر فرض ہے کہ ان کے علم کو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ سلام اللہ علیھم کی طرف لوٹا دیں۔

اگرچہ عملی طور پر یہ قول اکثر مفسرین میں رائج ہے اور وہ اس پر اعتماد کرتے ہیں لیکن یہ قول کئی اعتبار سے آیہ شریفہ "هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ

عَلَيْکَ الْکِتَابَ مِنْہُ آیَاتٌ مُحْکَمَاتٌ" اور دیگر قرآنی آیات کے اسلوبِ دلالت سے مطابقت نہیں رکھتا' کیونکہ:

اولاً" قرآن کریم میں ایسی آیات موجود نہیں ہیں کہ جن کے معانی سمجھنے کا کوئی راستہ ہی نہ ہو' نہ صرف یہ بلکہ قرآن شریف اپنے آپ کو ایسی صفات سے متصف کرتا ہے جو اس کی آیات کے مبہم ہونے کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتی ہیں مثلاً" نور' ہادی اور بیان۔

اس کے علاوہ یہ آیہ شریفہ:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (نساء : ۸۲)

ترجمہ : کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ ضرور اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

ہمیں یہ بتاتی ہے کہ قرآن شریف میں تدبر سے ہر قسم کا اختلاف دور ہو جاتا ہے جبکہ قول مشہور کے مطابق آیت متشابہ کا اختلاف کسی صورت میں بھی برطرف نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ آیات متشابہ سے مراد قرآنی سورتوں کے شروع میں موجود حروف مقطعات ہی ہیں۔ جیسا کہ الم' الر اور حم وغیرہ جن کے حقیقی معنی تک رسائی کا کوئی راستہ موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ بات مدنظر رہنی چاہئے کہ آیہ شریفہ میں آیات متشابہات کو آیات محکمات کے مقابل قرار دیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ آیات متشابہات کے بھی لغوی معانی ہیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ ان کے حقیقی معانی اور غیر حقیقی معانی میں تشابہ پایا جاتا ہے جبکہ حروف مقطعات کے کوئی لغوی معنی نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ آیہ شریفہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ٹیڑھے اور منحرف لوگ' لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے آیات متشابہات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسلام میں یہ بات اب تک نہیں سنی گئی کہ کسی نے

حروف مقطعات سے اس قسم کا استفادہ کیا ہو اور جنہوں نے ایسا استفادہ کیا ہے انہوں نے حروف مقطعات سے نہیں بلکہ سارے قرآن شریف سے ایسا استفادہ کیا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیہ شریفہ میں متشابہ کی تاویل اس مشہور قصہ کی طرف اشارہ(۴) ہے کہ جس کی رو سے یہود نے حروف مقطعات کا حساب لگا کر اسلام کی مدت بقا کا تعین کرنے کی کوشش کی تھی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حروف مقطعات کو یکے بعد از دیگرے پڑھ کر ان کے حساب میں خلل ڈال دیا۔ مگر یہ بات بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس واقعہ اور روایت کے درست ہونے کی صورت میں یہ بات سامنے آتی ہی کہ بعض یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں یہ بات کی اور اسی وقت انہیں اس کا جواب بھی مل گیا۔ اس واقعہ کی ایسی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ آیات متشابہ کی تاویل اور اتباع کے بارے میں اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔

علاوہ ازیں یہودیوں کی اس بات میں کوئی فتنہ انگیزی نہیں تھی اس لئے کہ کسی دین کا برحق ہونا اس کے کچھ مدت کے بعد قابل نسخ ہونے سے کوئی منافات نہیں رکھتا جیسا کہ اسلام سے پہلے کے آسمانی ادیان کا یہی حال ہے حالانکہ وہ برحق تھے۔

ثانیاً" یہ کہ اس قول کا لازمہ یہ ہے کہ اس آیہ شریفہ میں لفظ تاویل" سے خلاف ظاہر معنی مراد لئے جائیں اور یہ صرف آیات متشابہات سے مختص ہو مگر یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم تاویل اور تنزیل کی بحث میں اس مطلب پر روشنی ڈالیں گے کہ اولاً" تو قرآن شریف میں تاویل سے مراد وہ معنی اور مدلول نہیں ہے کہ لفظ اس پر لغوی دلالت رکھتا ہو۔ ثانیاً" یہ کہ تمام قرآنی آیات چاہے متشابہ ہوں یا محکم تاویل رکھتی ہیں۔

ثالثاً" آیہ شریفہ میں آیات محکمات کو "ھن ام الکتاب" سے متصف کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آیات محکمات قرآن شریف کے مرکزی اور اصلی مطالب پر مشتمل ہیں اور باقی مطالب ان پر قائم اور استوار ہیں۔ اس کا واضح لازمہ یہ ہے کہ آیات متشابہات کی مراد جاننے کے لئے انہیں آیات محکمات کی طرف پلٹا دیا جائے۔ بالفاظ دیگر ان کے معنی جاننے کے لئے آیات محکمات سے مدد لی جائے۔

بنا براین قرآن شریف میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں ہے جس کے حقیقی معنی تک کسی قسم کی دسترس نہ ہو۔ قرآنی آیات یا تو براہ راست محکم ہیں۔ جیسا کہ آیات محکمات یا بالواسطہ محکم ہیں جیسا کہ آیات متشابہ۔ جہاں تک سورتوں کے ابتداء میں آنے والے حروف مقطعات کا تعلق ہے' ان کے کسی قسم کے لغوی معانی نہیں ہیں لہذا وہ محکم اور متشابہ کی تقسیم سے خارج ہیں۔

یہ مفہوم آیہ شریفہ "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" اور آیہ شریفہ "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا" کے عموم سے ہاتھ آتا ہے۔

☆ قرآن کے محکم اور متشابہ میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا طرز عمل

آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے بیانات سے جو نتیجہ ہمارے ہاتھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایسی کوئی متشابہ آیت موجود نہیں ہے جس کے حقیقی معانی تک کسی قسم کی رسائی حاصل نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی آیت اپنے حقیقی معانی بیان کرنے میں خود کفیل نہ ہو تو دوسری آیات کی مدد سے ان کے حقیقی مفاہیم تک پہنچا جاسکتا ہے۔ یہ وہی متشابہ کو محکم کی طرف پلٹانے کا عمل ہے جیسا کہ آیہ شریفہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (طہ : ۵) (ترجمہ : رحمٰن عرش پر مستقر ہوا) اور آیہ

شریفہ وَجَاءَ رَبُّکَ (فجر : ۲۲) (ترجمہ : اور تیرا رب آیا) جیسی آیات اللہ تعالیٰ کی جسمیت اور مادیت پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن اگر ان دونوں آیات کو آیہ شریفہ لیس کمثلہ شی (شوریٰ : ۱۱) (ترجمہ : کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے) کی طرف پلٹایا جائے تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستقر ہونا یا اس کا آنا کسی جگہ پر مستقر ہونے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے معنی نہیں رکھتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن شریف کے بارے میں فرمایا ہے:

ان القران لم ینزل لیکذب بعضہ بعضاً ولکن نزل یصدق بعضہ بعضاً فما عرفتم فاعملوا بہ وما تشابہ علیکم فامنوابہ (۵)

ترجمہ : قرآن شریف اس لئے نازل نہیں ہوا کہ اسے کے حصے ایک دوسرے کو جھٹلائیں بلکہ اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس کے حصے ایک دوسرے کی تصدیق کریں۔ پس جو کچھ تم جان لو اس پر عمل کرو اور جو تم پر متشابہ ہوجائے اس پر ایمان لے آؤ۔

امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات میں ہے :

یشھد بعضہ علی بعض وینطق بعضہ ببعض (۶)

ترجمہ : قرآن کے کچھ حصے ایک دوسرے کے لئے گواہی دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد سے بولتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

المحکم ما یعمل بہ والمتشابہ ما اشتبہ علی جاھلہ (۷)

ترجمہ : محکم وہ ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے اور متشابہ وہ ہے جو اس کے جاھل پر مشتبہ ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ محکم اور متشابہ ہونا نسبی ہے اور ممکن ہے ایک آیت ایک شخص کے لئے محکم اور

دوسرے کے لئے متشابہ ہو۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

من رد متشابہ القران الی محکمہ ھدی الی صراط مستقیم۔ ۔ ۔ ثم قال۔ ۔ ان فی اخبارنا متشابھا کمتشابہ القران فر دوا متشابھھا الی محکمھا ولا تتبعوا متشابھا فتضلو(۷)

ترجمہ : جس نے قرآن کے متشابہات کو محکمات کی طرف پلٹایا وہ صراط مستقیم کی طرف ہدایت پاگیا۔ پھر فرمایا بے شک ہماری احادیث میں بھی متشابہات قرآن کی طرح متشابہات ہیں۔ پس ان کی متشابہات کو ان کی محکمات کی طرف پلٹا دو اور ان کی متشابہات کی اتباع نہ کرو کہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

یہ تمام احادیث، خاص طور پر آخری حدیث اس بات کی تصریح کرتی ہے کہ آیت متشابہ وہ آیت ہے جو اپنے مدلول کے اظہار میں خود کفیل نہ ہو اور اس کے معنی آیات محکمات کی روشنی میں نمایاں ہوتے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اس معنی تک رسائی کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

☆ تاویل اور تنزیل

قرآن مجید میں تین مرتبہ "تاویلِ قرآن" کا لفظ آیا ہے:

ا۔ آیت محکم و متشابہ جو پہلے مذکور ہو چکی ہے اسی کے دوسرے حصہ میں ہے:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران آیہ : ۸)

ترجمہ : پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی اتباع کرتے

ہیں تاکہ فتنہ انگیزی کریں اور اس کی تاویل کریں حالانکہ اس کی تاویل اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

۲ - وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (اعراف ۵۳)

ترجمہ : اور بے شک ہم ان کے پاس ایسی کتاب لے کر آئے جسے ہم نے علم کی بنیاد پر تفصیل دی، جو ایمان لانے والے لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے، کیا یہ اس کی تاویل کے علاوہ کسی اور چیز کے منتظر ہیں۔ جس دن اس کی تاویل آئے گی اس دن وہ لوگ جو پہلے سے اسے بھلا چکے ہوں گے کہیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسل برحق آئے۔

۳ - مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى --- بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (یونس : ۳۹)

ترجمہ : یہ قرآن قابل افترا نہیں ہے--- بلکہ ان لوگوں نے اس چیز کو جھٹلایا جس کے علم پر انہیں احاطہ نہ تھا۔ حالانکہ ابھی تک اس کی تاویل ان تک نہیں آئی ہے، (ان کے لئے عیاں نہیں ہے)۔ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے جھٹلایا تھا، پس دیکھ لیں ظالموں کا انجام کیسا تھا۔

بہرحال "تاویل" کا ماخذ "اول" ہے جس کے معنی رجوع کے ہیں۔ کسی تاویل سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف آیت رجوع کرتی ہے۔ تاویل کے مقابل، تنزیل ہے جس سے مراد آیت کے تحت الفظی واضح معنی ہیں۔

☆ تاویل کے معنی علماء اور مفسرین کی نظر میں

تاویل کے بارے میں علما میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس بارے

میں تحقیق سے، تاویل کے بارے میں دس سے زیادہ نظریات ملتے ہیں لیکن دو نظریات سب سے زیادہ مشہور ہیں :

۱ - قدما کا نظریہ : جس کی رو سے وہ تاویل کو تفسیر---- یعنی کلام کے ماحصل--- کے ہم معنی قرار دیتے تھے۔ اس قول کی رو سے تمام آیات کی تاویل موجود ہے۔ لیکن آیہ شریفہ **کی رو سے "وما یعلم تاویلہ الا اللہ"** متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

بنا براین بعض قدما نے کہا ہے کہ متشابہات سے مراد صرف حروف مقطعات ہیں جو سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن شریف کی وہ آیات جن کے معنی تمام لوگوں پر مجہول ہوں ان حروف مقطعات کے علاوہ اور کوئی نہیں ہیں۔ اس قول کا غلط ہونا ہم گزشتہ صفحات میں واضح کرچکے ہیں۔

بہرحال ان حقائق کے پیش نظر کہ قرآن شریف بعض آیات کی تاویل کے علم کی غیر اللہ سے نفی کرتا ہے اور یہ کہ قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں ہیں ہے جس کی تاویل یعنی اس معانی کا ماحصل سب پر پوشیدہ ہو اور یہ کہ سورتوں کے آغاز میں موجود حروف مقطعات کو آیات متشابہات نہیں کہا جاسکتا، یہ قول متاخرین کی نظر میں باطل اور متروک ہے۔

۲ - متاخرین کا نظریہ : اس نظریہ کے مطابق "تاویل" سے مراد وہ خلاف ظاہر معنی ہیں جن کا کلام سے ارادہ کیا گیا ہو۔ بنا برین تمام قرآنی آیات تاویل نہیں رکھتی ہیں بلکہ صرف آیات مشابہات ہیں جو تاویل رکھتی ہیں اور خلاف ظاہر معانی پر مشتمل ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی مکمل آگاہی نہیں رکھتا۔ مثلاً" وہ آیات جن میں جسمیت، آمد، بیٹھنے، ناراضگی، افسوس اور اس طرح کے دیگر مادی لوازمات کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دی گئی ہے اور وہ آیات جو انبیاء و رسل کی طرف معصیت

کی نسبت دیتی ہیں۔

یہ نظریہ عملی طور پر اس قدر رائج ہوچکا ہے کہ موجودہ حالات میں لفظ "تاویل" سے "خلاف ظاہر معنی" ہی مراد لئے جاتے ہیں اور کلامی مباحثات میں قرآنی آیات کی تاویل کا مطلب یہ ہوچکا ہے کہ آیت کے ظاہری معانی کو نظر انداز کردیا جائے۔ یوں تاویل کے نام پر آیات کو خلاف ظاہر معانی پر محمول کرنا ایک معمول بن چکا ہے حالانکہ یہ روش تناقض سے خالی نہیں ہے(۹)

یہ قول اگرچہ بہت مشہور ہے تاہم درست نہیں ہے اور قرآنی آیات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا اس لئے کہ:

اولاً"۔ سورہ اعراف کی آیت "هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ" اور سورہ یونس کی آیت "بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ" جو کہ گزشتہ فصل میں گزر چکی ہیں، یہ ظاہر کرتی ہیں کہ سارا قرآن تاویل رکھتا ہے اور یہ کہ تاویل صرف آیات متشابہات سے مختص نہیں ہے، جبکہ یہ قول اسی اساس پر قائم ہے۔

ثانیاً"۔ اس قول کا لازمہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایسی آیات کے وجود کو تسلیم کرلیا جائے جن کے حقیقی معنی مشتبہ اور لوگوں کے لئے مجہول ہوں، جنہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہ جانتا ہو۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو کلام اپنے معنی ادا کرنے سے قاصر ہو اسے بلیغ نہیں کہا جاسکتا جبکہ قرآن مجید دنیائے فصاحت و بلاغت کے سامنے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فصاحت و بلاغت میں وہ سب سے برتر ہے۔

ثالثاً"۔ اس قول کی رو سے قرآن شریف کی حجت تمام نہیں ہوسکتی اس لئے کہ آیہ کریمہ:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا" كَثِيرًا (نساء :۸۲)

ترجمہ : کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو یہ یقیناً" اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

قرآن شریف کے کلام بشر نہ ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کی آیات میں کسی قسم کا اختلاف موجود نہیں ہے (حالانکہ جن حالات ادوار اور شرائط میں قرآنی آیات نازل ہوئی ان میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے) اور اگر بادی النظر میں قرآنی آیات میں کوئی اختلاف نظر بھی آئے تو وہ تدبر سے برطرف ہو جاتا ہے۔

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ قرآن مجید کی آیات کی ایک اچھی خاصی تعداد جنہیں متشابہات کہا جاتا ہے، محکمات سے اختلاف رکھتی ہوں اور اس اختلاف کے برطرف کرنے کا اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہ ہو کہ یہ کہہ دیا جائے کہ ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں بلکہ ان کے معنی کچھ اور ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، تو اس اختلاف کے حل کا یہ طریقہ ہرگز اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ قرآن شریف کلام بشر نہیں ہے۔

اسی طرح اگر اختلاف برطرف کرنے کا یہ راستہ اختیار کرلیا جائے کہ ہر وہ آیت جس کا مضمون محکمات اور مسلمات قرآن کے مخالف اور مناقض ہو، اس کے ظاہری معنی کو نظر انداز کرکے اسے غیر ظاہر معنی پر محمول کرلیا جائے (جسے اصطلاح میں تاویل کہتے ہیں) تو یہ بھی درست نہیں ہے اس لئے کہ اس طرح کی تاویل کی مدد سے ہر قسم کا تناقض چاہے انسانی کلام میں ہی ہو برطرف کیا جاسکتا ہے۔

رابعاً"۔ اس بات پر سرے سے کوئی دلیل ہی موجود نہیں ہے کہ آیت محکم و متشابہ میں تاویل سے خلاف ظاہر معنی مراد ہیں۔ قرآن شریف میں اور بھی جن مقامات پر لفظ تاویل استعمال ہوا ہے اس سے یہ معنی مراد نہیں ہیں۔ مثلاً" حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں تین مقامات پر

تعبیر خواب کو "تاویل" کہا گیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ خواب کی تعبیر سے خواب کے خلاف ظاہر معنی مراد نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد ایک خارجی حقیقت ہے جو خواب میں ایک خاص انداز میں نظر آتی ہے جیسا کہ (ا) حضرت یوسف علیہ السلام نے ماں باپ اور بھائیوں کے سجدہ کو سورج چاند اور ستاروں کے سجدہ کی صورت میں دیکھا۔ بادشاہ مصر نے سات سالہ قحط کو سات دبلی گائیوں کی شکل میں دیکھا جو سات موٹی اور فربہ گائیوں کو کھا رہی ہیں، اسی طرح اس نے سات سبز اور سات خشک خوشے بھی دیکھے۔ زندان میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھیوں نے بادشاہ کی سقائی اور مصلوب ہونے کو انگور نچوڑنے اور سر پر روٹیوں کے طبق کی صورت میں دیکھا جس میں سے پرندے کھا رہے تھے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب خضر کے واقعہ میں جو سورہ کہف آیات ۷۱ تا ۸۲ میں مذکور ہے، جب جناب خضر نے کشتی میں سوراخ کیا، اس کے بعد لڑکے کو قتل کیا اور اس کے بعد دیوار کو کھڑا کیا اور ہر مرحلہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا تو حضرت خضر نے تمام کاموں کی حقیقت، جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دیئے تھے حضرت موسیٰ کو بتا دی اور اسے تاویل کا نام دیا۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہاں پر ان کاموں کی حقیقت اور ان کی روح کو تاویل کا نام دیا گیا ہے نہ کہ ان کے خلاف ظاہر معانی کو۔

اسی طرح خداوند متعال تولنے اور ماپنے کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (اسریٰ : ۳۵)

ترجمہ : "اور ماپتے وقت پیمانہ پوری طرح سے بھرو اور درست ترازو سے تولا کرو یہ اچھا اور تاویل کے اعتبار سے بہتر ہے۔

ظاہر ہے کہ ناپ تول کی تاویل ایک خاص اقتصادی حالت ہے جو

ضروریات زندگی کے لین دین میں بازار میں رونما ہوتی ہے۔ تاویل کے یہ معنی "کیل" (پیمانے کے ذریعے ماپنے) اور "وزن" (تولنے) کے خلاف ظاہر معنی نہیں ہیں بلکہ ایک خارجی حقیقت ہے' ایک روح ہے جو کیل اور وزن کے پیکر میں پھونکی گئی ہے' جو ان دونوں کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کی صورت میں اپنے اثر و نتیجہ کے اعتبار سے طاقتور یا کمزور ہوجاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ ۔---- ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (نساء : ۵۹)

ترجمہ : پس اگر کسی چیز پر تم میں نزاع پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پلٹا دو---- یہ اچھا اور تاویل کے اعتبار سے بہتر ہے"

ظاہر ہے کہ اختلاف کو اللہ اور رسول کی طرف پلٹا دینے کی تاویل سے مراد معاشرتی وحدت کا قائم رہنا اور معاشرے میں روحانی تعلق کا استوار رہنا ہے اور یہ ایک خارجی حقیقت ہے نہ کہ اختلاف کے پلٹانے کے خلاف ظاہر معنی۔

اسی طرح دیگر مقامات بھی جہاں لفظ تاویل استعمال ہوا جن کی تعداد مذکورہ مقامات سمیت سولہ ہے' کہیں بھی تاویل سے "خلاف ظاہر معنی" مراد نہیں لئے جاسکتے بلکہ ان کے معانی کچھ اور ہیں (جیسا کہ اگلی فصل میں بیان ہوگا) جو کہ آیت محکم و متشابہ میں موجود لفظ "تاویل" پر منطبق ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس آیت میں لفظ "تاویل" سے خلاف ظاہر معنی مراد لئے جائیں۔

☆ معنی تاویل ازروئے قرآن

وہ آیات جن میں لفظ "تاویل" کا ذکر ہوا ہے' جن میں سے بعض کو ہم نے گزشتہ فصلوں میں بیان کیا ہے' ان سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تاویل ان معانی میں سے نہیں ہے جن پر لفظ دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ یہ

بات واضح ہے کہ سورہ یوسف میں جو خواب بیان کئے گئے اور ان کی تاویل بتائی گئی، خواب کو بیان کرنے والے الفاظ میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو خواب کی تاویل پر لفظی اعتبار سے دلالت کرتا ہو، چاہے خلاف ظاہر بھی ہو۔

اسی طرح موسیٰ اور خضر کے واقعات میں استعمال کئے گئے الفاظ ان تاویلوں پر دلالت نہیں کرتے جو حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کے لئے بیان کیں۔ اسی طرح "وَاَوْفُوا الْمِكْيَالَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ" جو دو جملوں پر مشتمل ہے ہرگز اس خاص اقتصادی حالت پر دلالت نہیں کرتی جو اس حکم کی تاویل ہے۔

اسی طرح آیہ شریفہ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" اپنی تاویل پر، جو کہ وحدت اسلامی ہے، لفظی دلالت نہیں رکھتی۔ باقی آیات میں غور کرنے سے بھی یہی حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ بلکہ خوابوں کے معاملہ میں خواب کی تاویل ایک خارجی حقیقت ہے جو ایک خاص صورت میں خواب دیکھنے والے کو نظر آتی ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر کے واقعہ میں بھی جو تاویل حضرت خضر نے بیان کی وہ ایسی حقیقت ہے جس کی بنیاد پر وہ کام انجام دیا گیا اور در حقیقت ایک طرح وہ فعل اس تاویل کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ جو ناپ تول کو صحیح طرح سے انجام دینے کا حکم دیتی ہے، اس کی تاویل ایک ایسی عام حقیقت اور مصلحت ہے جس پر اس حکم کی بنیاد رکھی گئی ہے، اور کسی نہ کسی طرح اس کو حقیقت کا روپ دیتی ہے جس آیت میں اختلاف اور نزاع کو خدا و رسول کی طرف پلٹانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی یہی صورتحال ہے۔

بنا بریں ہر چیز کی تاویل وہ حقیقت ہے جو اس کا ماخذ اور سرچشمہ ہے اور وہ چیز کسی نہ کسی طرح اسے عملی روپ دیتی ہے اسے اپنے دامن میں لئے ہوتی ہے اور اس کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہ معنی قرآن مجید میں بھی جاری و ساری ہیں۔اس لئے کہ اس مقدس کتاب کا ماخذ بعض ایسے حقائق اور معنویات ہیں جو مادیت اور جسمانیت کی قید سے آزاد' حواس اور محسوسات سے بالاتر اور الفاظ و عبارات کے پیکر سے' جو کہ ہماری مادی زندگی کا نتیجہ ہیں کہیں زیادہ وسیع تر ہیں۔

یہ حقائق اور معنویات حقیقی طور پر لفظی بیان کے قالب میں نہیں سماسکتے۔ جو کچھ بارگاہ غیب کی طرف سے کیا گیا ہے وہ یہ کہ ان الفاظ کے ذریعے عالم انسانیت کو توجہ دلائی گئی ہے کہ عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کے ظواہر کے ذریعے اپنے آپ کو اس سعادت کے قابل بنائیں جسے مشاہدہ و معائنہ کے بغیر درک نہیں کیا جاسکتا اور قیامت کے دن' جو کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا دن ہے' یہ حقائق پورے طور پر آشکار ہوں گے جیسا کہ سورہ اعراف اور سورہ یونس کی دو آیات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ وَاِنَّهُ فِيْٓ اُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (زخرف : ۴)

ترجمہ : اور قسم ہے کتاب مبین کی' ہم نے اسے عربی (واضح) قرآن بنایا تاکہ شاید تم عقل کی راہ اختیار کرو حالانکہ یہ ام الکتاب میں ہمارے پاس بلند مرتبہ (عام لوگوں کے افہام کی رسائی سے دور) اور محکم ہے (یعنی اس میں رخنہ اندازی ممکن نہیں ہے)

آیت کے آخری حصے اور تاویل کے جو معنی مذکور ہوئے ہیں' ان کی مطابقت واضح ہے' خاص طور پر اس لحاظ سے کہ **لعلکم تعقلون** کے الفاظ کا استعمال ہوا ہے نہ کہ **لعلکم تعقلونہ** (تاکہ شائد اس کا ادراک کرسکو)' اس لئے کہ آیہ محکم و متشابہ کی رو سے تاویل کا علم اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہے (**وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ**)۔ اس آیت میں اہل

انحراف کی آیت متشابہات کی پیروی کی وجہ سے مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ فتنہ گری اور ان آیات کی تاویل چاہتے ہیں۔یہ نہیں فرمایا کہ وہ ان کی تاویل کو پالیتے ہیں۔

پس تاویل قرآن سے مراد وہ حقیقت یا حقائق ہیں جو ام الکتاب میں اللہ تعالٰی کے پاس ہیں اور عالم غیب سے مختص ہیں۔

ایک اور مقام پر بھی تقریباً" یہی مضمون اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (واقعہ : ۸۰)

ترجمہ : پس قسم ہے ستاروں کے مواقع کی' اور یقیناً" یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جان سکو' یہ محترم قرآن ایک محفوظ اور پوشیدہ کتاب (ام الکتاب) میں ہے' اسے پاک شدہ افراد کے علاوہ کوئی نہیں چھو سکتا' یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن شریف کے دو مقام ہیں۔ مقام کتاب مکنون جسے کوئی چھونے والا نہیں چھوسکتا اور مقام تنزیل جو کہ لوگوں کے لئے قابل فہم ہے۔

-ان آیات اور گزشتہ آیات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ **الاالمطهرون** کا استثنا ہے۔ اس کی رو سے صرف یہی لوگ قرآن مجید کی حقیقت اور تاویل کو پہنچ سکتے ہیں اور یہ بات **وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ** سے منافات نہیں رکھتی اس لئے کہ ان دو آیات کے ایک دوسرے کے ساتھ انضمام سے استقلال اور احتیاج کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالٰی ان حقائق کا علم جاننے میں مستقل ہے اور اس کے علاوہ کوئی ان حقائق کا علم اس کی اجازت اور اس کے سکھائے بغیر نہیں جان

سکتا۔

یہ معاملہ بھی بعینہ علم غیب کی طرح ہے جو کہ بہت سی آیات کی رو سے اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہے جبکہ ایک آیت میں اس کے پسندیدہ بندوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (جن : ۲۷)

اس آیت سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ استقلالی حیثیت میں علم غیب اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہے اور اس کے اذن کے بغیر کوئی دوسرا اس کا سزوار نہیں ہوسکتا۔

ان آیات کی رو سے مطہر و ن حقیقت قرآن کو مس کر سکتے ہیں اور آیہ تطہیر:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (احزاب: ۳۳)

کے پیش نظر جو کہ اخبار متواترہ کے مطابق اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نازل ہوئی ہے' رسول اللہ اور ان کے اہل بیت' پاک شدہ ہستیاں ہیں جو تاویل قرآن کا علم رکھتی ہیں۔

☆ ناسخ و منسوخ

قرآن شریف کی آیات احکام میں ایسی آیات موجود ہیں جنہوں نے پہلے سے نازل شدہ آیات کے حکم کو جو کہ نافذ العمل تھا' منسوخ کر کے ان کی جگہ خود لے لی۔ پہلی آیات کو منسوخ اور بعد والی آیات' جن کا حکم پہلی آیات کے حکم پر حاوی اور حاکم ہے' ناسخ کہلاتی ہیں۔ جیسا کہ

ابتدائے بعثت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ اہل کتاب کے ساتھ بنا کر رکھیں:

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ (بقرہ : ۱۵۹)

ترجمہ : پس عفو و درگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے۔

کچھ عرصے کے بعد آیت قتال کا نزول ہوا جس نے مسالمت کے حکم کو منسوخ کردیا:

قَاتِلُوْا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (توبہ : ۲۹)

ترجمہ : جنگ کرو ان لوگوں کے ساتھ جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور حرام خدا کو حرام نہیں قرار دیتے اور دین حق کو اختیار نہیں کرتے' جو کہ اہل کتاب ہیں۔

جو نسخ ہم انسانوں کے درمیان رائج ہے' اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی مصلحت کے پیش نظر ایک حکم صادر کرکے اس پر عمل شروع کردیا جاتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد جب اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے' تو اس حکم کو کالعدم قرار دے کر اس کی جگہ دوسرا حکم صادر کردیا جاتا ہے۔ یہ نسخ جس کا لازمہ خطا اور جہل ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن مجید' جس کی آیات میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا' اس میں اس قسم کا کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں نسخ کے معنی یہ ہیں کہ منسوخ کئے جانے والے حکم کے موثر ہونے کے دور کے اختتام کو بیان کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر پہلے حکم کی مصلحت شروع سے ہی ایک محدود مدت کے لئے ہوتی ہے۔ قدرتی سی بات ہے کہ عارضی مصلحت کا اثر یعنی اس کا حکم بھی محدود مدت کے لئے صادر ہوگا۔ کچھ مدت کے

بعد دوسرا حکم صادر ہو کر پہلے حکم کی مدت کے خاتمہ کا اعلان کردیتا ہے۔ اس بات کے پیش نظر کہ قرآن مجید تدریجا" تئیس برس کی مدت میں نازل ہوا' اس میں اس قسم کے احکام کا وجود مکمل طور پر قابل تصور ہے۔

البتہ اگر کسی مقام پر حالات ایسے ہوں کہ دائمی حکم کے تقاضے پورے نہ ہوں اور بعد میں یہ تقاضے پورے ہو جائیں تو ایسی صورت میں عارضی حکم کو دائمی حکم میں تبدیل کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ

(نحل : ۱۰۲)

ترجمہ : اور جب ہم کسی آیت کی جگہ دوسری آیت لے آتے ہیں' اور اللہ بخوبی جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرتا ہے' تو یہ لوگ کہتے ہیں آپ افترا پرداز ہیں۔ بلکہ ان کی اکثریت علم سے بے بہرہ ہے۔ کہہ دیجئے اسے روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ثبات عطا کرے اور یہ احکام الٰہی کو تسلیم کرنے والوں کے لئے ہدایت اور بشارت ہے۔

☆ جری و انطباق

اس حقیقت کے پیش نظر کہ قرآن شریف ایک عمومی اور دائمی کتاب ہے' وہ غائب پر بھی حاضر کی مانند جاری ہوتی ہے اور حال کی طرح ماضی اور مستقبل پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ مثلا" وہ آیات جو کہ بعض خاص شرائط کے تحت نزول قرآن کے زمانے کے مسلمانوں کے لئے کوئی خاص حکم لے کر آئی ہیں' ان کا حکم زمانہ نزول کے بعد آنے والے ان مسلمانوں پر بھی بغیر کسی کمی بیشی کے لاگو ہوگا جو ان جیسے حالات رکھتے

ہوں۔ اسی طرح وہ آیات جو بعض صفات کے حامل افراد کی تعریف، یا سرزنش کرتی ہیں یا بشارت دیتی ہیں یا ڈراتی ہیں، ہر زمان و مکان کے ان تمام افراد پر منطبق ہوتی ہیں جو ان صفات سے متصف ہوں۔

لہذا کسی بھی آیت کا شان نزول اس کا مخصص نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی آیت کسی ایک یا چند افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہو تو وہ ان افراد تک محدود نہیں ہوگی بلکہ جہاں بھی ان افراد کی خصوصیات کے حامل افراد موجود ہوں، یہ آیت وہاں تک سرایت کرجائیگی اور ان پر بھی جاری ہوگی۔ قرآن شریف کی اسی خاصیت کو روایات میں جَرْیٌ (جاری ہونا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں(۱۱): اگر ایسا ہوتا کہ جب کوئی آیت کچھ افراد کے بارے میں نازل ہو، اور ان کے مرنے کے ساتھ وہ آیت بھی مر جائے تو قرآن شریف میں سے کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ لیکن جب تک زمین اور آسمان قائم ہیں، قرآن شریف جاری ہے اور ہر گروہ کے لئے ایک آیت ہے جسے وہ پڑھتے ہیں اور اس سے فائدہ یا نقصان(۱۲) پاتے ہیں۔

بعض روایات(۱۳) میں بطن قرآن یعنی ان مقامات پر قرآن کے انطباق کو جو تحلیل کے ذریعے پیدا ہوئے ہیں، جری میں سے قرار دیا گیا ہے۔

☆ تفسیر قرآن کا آغاز اور اس کا سفر

قرآن شریف کے الفاظ اور عبارات کے بیان اور تفسیر کا آغاز زمانہ نزول قرآن سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن شریف کی تعلیم دینے اور اس کے مقاصد اور معانی کو بیان فرماتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاَنزَلْنَا اِلَیکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (نحل : ۴۴)

ترجمہ : اور ہم نے آپ کی طرف ذکر کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے

لئے اس چیز کو بیان کریں جو ان کی طرف نازل کی گئی۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (جمعہ : ۲)

ترجمہ : اسی نے اُمیوں میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

آنحضرت کے دور میں آپ کے حکم سے بعض لوگ قرآن شریف کی قرائت اور حفظ میں مصروف رہتے تھے جنہیں قراء کہا جاتا تھا۔ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کے صحابہ اور بعد میں باقی مسلمان تفسیر میں مشغول ہوگئے اور اب تک مشغول ہیں۔

☆ علم تفسیر اور طبقات مفسرین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بعض صحابہ مثلاً" ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، جابر بن عبداللہ، ابو سعید خدری، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر، انس، ابوہریرہ، ابوموسیٰ اور عبداللہ بن عباس تفسیر کا کام انجام دیتے رہے۔ ان میں عبداللہ بن عباس سب سے زیادہ معروف ہیں۔

ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ کبھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنے ہوئے قرآنی آیات کے معانی کو مُسند روایت کی صورت میں بیان کردیتے(۱) تھے۔ ایسی احادیث کی تعداد مجموعی طور پر۔۔ اول قرآن سے آخر تک۔۔۔ دو سو چالیس اور کچھ احادیث ہیں۔ ان میں بہت سی سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں جبکہ بعض کا متن (مضمون) درست نہیں ہے۔ اور کبھی ایسا بھی کرتے تھے کہ آیات کی تفسیر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت دیئے بغیر بیان کرتے تھے۔ بعد میں آنے والے اھل

سنت کے مفسرین اس قسم کو بھی تفسیر میں وارد روایات نبوی کا حصہ سمجھتے ہیں۔اس لئے کہ صحابہ نے قرآن کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھا اور یہ بات خارج از امکان نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنے پاس سے کچھ کہا ہو۔ لیکن اس بات پر کوئی قطعی دلیل نہیں۔ علاوہ براین' ان روایات میں سے بہت سی ایسی ہیں جو آیات کے شان نزول اور ان کے تاریخی واقعات کو بیان کرتی ہیں۔ اسی طرح صحابہ کی ان رویات میں کعب الاحبار جیسے یہودی علماء جو کہ مسلمان ہوگئے تھے' کی باتیں بھی سند کے بغیر پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح ابن عباس اکثر اوقات قرآن کے معانی بیان کرتے ہوئے اشعار کو مثال کے طور پر بیان کرتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ازرق بن نافع کے سوالات کے بارے میں عبداللہ بن عباس سے منقول روایت میں دو سو سے زائد سوالات کے جواب میں اشعار کو پیش کیا گیا ہے۔ سیوطی نے اپنی کتاب اتقان میں ان میں سے ایک سو نو(۱۵) سوال نقل کئے ہیں۔ ان حالات میں ممکن نہیں ہے کہ مفسرین صحابہ کی روایات کو احادیث نبوی قرار دیا جائے یا اس بات کو نظر انداز کردیا جائے کہ صحابہ نے اپنی رائے سے کام نہ لیا ہوگا۔ مفسرین نے صحابہ کو مفسرین کا طبقہ اول قرار دیا ہے۔

دوسرا طبقہ جماعت تابعین ہین جو کہ مفسرین صحابہ کے شاگرد ہیں جیسا کہ مجاہد(۱٦)' سعید بن جبیر' عکرمہ اور ضحاک' حسن بصری' عطا بن ابی رباح' عطا بن ابی مسلم' ابوالعالیہ' محمد بن کعب قرظی' قتادہ' عطیہ' زید بن اسلم اور طاؤس یمانی بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

تیسرا طبقہ دوسرے طبقے کے مفسرین کے شاگردوں کا ہے جیسے ربیع بن انس' عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم' ابو صالح کلبی(۱۷) اور ان جیسے دیگر افراد۔ تابعین کا طریقہ تفسیر یہ تھا کہ بعض اوقات آیات کی تفسیر کو

روایت کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ان کے صحابہ سے نقل کرتے تھے اور کبھی کسی کی طرف منسوب کئے بغیر بیان کردیتے تھے۔ مفسرین متاخرین اس قسم کے اقوال کو بھی روایات نبوی کے ہم پایہ قرار دیتے ہیں اور انہیں روایات موقوفہ(۱۸) کا نام دیتے ہیں۔

چوتھا طبقہ ان مفسرین کا ہے جنہوں نے کتب تفسیر کی تالیف کی۔ مثلاً سفیان بن عینہ(۱۹)، وکیع(۲۰) بن جراح، شعبہ(۲۱) بن حجاج، عبد(۲۲) بن حمید وغیرہ۔ تفسیر طبری جو کہ ایک مشہور تفسیر ہے، اس کے مولف ابن جریر(۲۳) طبری کا تعلق بھی اسی طبقہ سے ہے۔

اس طبقہ کا طریقہ بھی یہ تھا کہ اقوال صحابہ و تابعین کو روایات معنعن کی صورت میں اپنی کتب تفسیر میں لکھتے تھے اور اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ البتہ ابن جریر طبری بعض اوقات اپنی تفسیر میں اقوال کی ترجیح کے بارے میں اظہار نظر کرتے تھے۔ طبقات متاخرین کا آغاز اسی گروہ سے ہوتا ہے۔

پانچواں طبقہ ان مفسرین کا ہے جو روایات کی اسناد کو حذف کرکے انہیں اپنی کتب میں درج کردیتے تھے اور صرف نقل اقوال پر اکتفا کرتے تھے۔

بعض(۲۴) علما کا کہنا ہے کہ تفسیر میں بے نظمی کا آغاز یہیں سے ہوا ہے۔ ان تفاسیر میں بہت سے اقوال سند کا خیال رکھے بغیر صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب کردیئے گئے ہیں۔ اس طرح بہت سے جعلی اقوال پیدا ہوگئے اور اقوال کا اعتبار متزلزل ہوگیا ہے۔

لیکن اگر روایات معنعن کا بھی غور و تدبر سے مطالعہ کیا جائے تو اس بات میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ ان میں بھی جعلی روایات بکثرت موجود ہیں، ایک ہی صحابی یا تابعی کی طرف متضاد اور متخالف روایات منسوب کی گئی ہیں۔ ان روایات میں ایسے قصے اور حکایات بھی

موجود ہیں جن کا جھوٹ ہونا یقینی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان روایات میں ایسی ناسخ و منسوخ آیات یا ایسے شان نزول کا تذکرہ پایا جاتا ہے جو آیات کے سیاق و سباق سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ایسے واقعات ایک دو نہیں ہیں کہ انہیں نظر انداز کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل نے، جو کہ اس طبقہ کی پیدائش سے پہلے تھے، کہا ہے کہ تین چیزیں بے بنیاد ہیں۔ مغازی (جنگوں کے واقعات) ملاحم (پیشین گوئیاں) اور روایات تفسیر۔ امام شافعی سے بھی منقول ہے کہ ابن عباس سے منقول روایات میں سے صرف تقریباً" ایک سو ثابت ہیں۔

چھٹا طبقہ ان مفسرین کا ہے جو مختلف علوم کی پیدائش اور اسلام میں ان کے نفوذ کے بعد پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے مخصوص علم سے جس میں وہ مہارت رکھتا تھا، قرآن شریف کی تفسیر کی، زجاج، واحدی اور ابی حیان جیسے علمائے نحو نے آیات قرآن کے اعراب سے بحث کی(۲۵) زمخشری(۲۶) جو کہ علم معانی بیان کے بیان میں مہارت رکھتے تھے، انہوں نے اپنی تفسیر کشاف میں فصاحت و بلاغت کے حوالے سے بحث کی ہے۔ متکلمین نے علم کلام کی راہ سے قرآن شریف کی تفسیر کی مثلاً" فخر رازی(۲۷) نے تفسیر کبیر میں یہ انداز اختیار کیا ہے۔ ابن عربی اور عبدالرزاق(۲۸) کاشی جیسے عرفاء نے قرآن شریف کی عرفانی تفسیر کی ہے۔

محدثین نے احادیث کی روشنی میں قرآن شریف کی تفسیر کی جس کی مثال تفسیر ثعلبی (۲۹) ہے۔ فقیہ نے فقہ کی رو سے قرآن شریف کی تفسیر کی جس کی مثال تفسیر قرطبی(۳۰) ہے۔ بعض نے مختلف علوم کی مدد سے مخلوط قسم کی تفاسیر لکھی ہیں جیسا کہ تفسیر روح البیان(۳۱)، تفسیر روح المعانی(۳۲) اور تفسیر نیشاپوری (۳۳)۔

ان علما نے تفسیر کی یہ خدمت کی کہ اسے اس جمود سے باہر نکالا جو

کہ گزشتہ پانچ طبقات کے دور میں اس پر طاری تھا۔ ان علماء نے علم تفسیر میں بحث و نظر کا دروازہ کھول دیا۔ یہ اور بات ہے کہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بات بخوبی عیاں ہوجاتی ہے کہ ان میں سے اکثر تفسیری بحوث میں ان علوم کے نظریات قرآن شریف پر مسلط کئے گئے ہیں جبکہ خود قرآنی آیات ان مضامین پر دلالت نہیں کرتی ہیں۔

☆ شیعہ مفسرین کے طبقات اور ان کی روش

اب تک جن طبقات کا ذکر ہو رہا تھا وہ مفسرین اہل سنت والجماعت کے تھے۔ ان کا سرچشمہ ایک مخصوص روش تھی جو پہلے دن سے تفسیر میں اپنائی گئی۔ اور وہ روش یہ تھی کہ صحابہ اور تابعین کے اقوال کو بھی وہی مقام دیا جاتا تھا جو احادیث نبوی کو حاصل تھا اور ان اقوال کے سامنے اپنی رائے قائم کرنے کو نص کے مقابل اجتہاد کی مانند سمجھا جاتا تھا' یہاں تک کہ ان روایات کا جعلی ہونا اور ان کے باہمی تضادات آشکار ہوگئے اور چھٹے طبقہ کے مفسرین کے لئے یہ مجال پیدا ہوگئی کہ وہ اپنی اجتہادی آراء کا اظہار کرسکیں۔

لیکن تفسیر میں جو روش اہل تشیع نے اختیار کی وہ اس روش سے مختلف ہے۔ لہٰذا ان کے ہاں مفسرین کی طبقہ بندی بھی مختلف ہے۔

اہل تشیع اقوال رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نص قرآن کی رو سے تفسیر قرآن میں حجت مانتے ہیں جبکہ صحابہ اور تابعین کے اقوال کو عام مسلمانوں کے اقوال کی مانند کوئی اہمیت نہیں دیتے مگر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی صورت میں ہو۔ جبکہ حدیث ثقلین کی رو سے' جو کہ متواتر حدیث ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کے اقوال کو خود آنحضرت کے اقوال کی طرح حجت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا تفسیری روایات میں سے اہل تشیع صرف ان روایات کو قبول کرتے ہیں جو رسول اللہ اور اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں

انہوں نے اپنے مفسرین کی طبقہ بندی بھی اس طرح کی ہے۔

پہلا طبقہ ان افراد کا ہے جنہوں نے تفسیری روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے لیں اور انہیں کسی ترتیب کے بغیر اپنے اصول(۳۴) میں ثبت کرلیا اور انہیں بیان کرتے رہے مثلاً" زراہ(۳۵)' محمد بن مسلم' معروف اور جریر جیسے افراد۔

دوسرا طبقہ ابتدائی تفاسیر کے مولفین کا ہے جیسے فرات بن ابراھیم' ابوحمزہ ثمالی' عیاشی(۳۷)' علی(۳۸) بن ابراہیم قمی اور نعمانی(۳۹)۔ تفسیر میں ان کا طریقہ کار اہل سنت کے چوتھے طبقہ کے مفسرین جیسا تھا۔ یہ تفسیری احادیث کو پہلے طبقہ کے مفسرین سے لیکر سند کے ساتھ اپنی کتب میں تحریر کردیتے تھے اور اپنی رائے کے اظہار سے اجتناب کرتے تھے۔ چونکہ حضورِ آئمہ کا زمانہ کافی طویل تھا' جو تقریباً" تین سو سال ہے' لہٰذا قدرتی طور پر مفسرین کے ان دو طبقات میں زمانے کے اعتبار سے ترتیب موجود نہ تھی بلکہ ان میں تداخل پایا جاتا تھا۔ اسی طرح ایسے افراد کی تعداد بھی بہت کم تھی جو روایات کی سند کو حذف کرکے انہیں بیان کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں نمونہ کے طور پر تفسیر عیاشی کو پیش کیا جاسکتا ہے جسے عیاشی کے ایک شاگرد نے مرتب کیا اور اختصار کی غرض سے اسناد کو حذف کردیا۔ بعد میں عیاشی کے اصل نسخہ کی جگہ یہی نسخہ رائج ہوگیا۔

تیسرا طبقہ مختلف علوم کے ماہرین کا ہے جیسا کہ سید رضی(۴۰) کی ادبی تفسیر' شیخ طوسی(۴۱) کی کلامی تفسیر جو التبیان کے نام سے معروف ہے' صدر المتالهین شیرازی(۴۲) کی فلسفی تفسیر' میبدی گونا بادی(۴۳) کی عرفانی تفسیر' شیخ عبد علی ہویزی(۴۳) کی تفسیر نور الثقلین' سید ہاشم بحرانی کی تفسیر البرہان اور فیض کاشانی کی تفسیر صافی۔ بعض علما نے اپنی تفاسیر میں مختلف علوم کی روشنی میں تفسیر کی ہے جیسا کہ شیخ طبرسی(۴۴) نے مجمع البیان میں لغت' نحو' قرائت' کلام اور حدیث کی رو سے بحث کی ہے۔

قرآن شریف کی تفسیر پذیری

☆ قرآن شریف کیسے تفسیر قبول کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب گزشتہ فصول سے روشن اور آشکار ہے اس لئے کہ:

ایک طرف سے قرآن شریف ایک عمومی اور ابدی کتاب ہے جو سب سے مخاطب ہو کر انہیں اپنے مقاصد کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سب کو دعوت مبارزہ دیتے ہوئے ان پر حجت تمام کرتی ہے اور اپنے آپ کو نور، مبین اور بیان کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے۔ لہٰذا ظاہر سی بات ہے ایسی واضح اور آشکار چیز کو واضح اور آشکار ہونے کے لئے کسی اور چیز کا محتاج نہیں ہونا چاہئے۔ قرآن شریف اپنے کلام بشر ہونے کی نفی کرتے ہوئے فرماتا ہے: کیا یہ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے، اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ یقیناً" اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے(۴۵)۔ بالفاظ دیگر قرآن شریف کی آیات میں اگر کوئی اختلاف نظر آتا بھی ہے تو وہ آیات میں تدبر کے ذریعے برطرف ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کلام خدا نہ ہوتا تو اس طرح نہ ہوتا۔" اگر ایسا کلام اپنے مقاصد کی وضاحت کے لئے کسی اور چیز کا محتاج ہو تو یہ حجت ناقص ہوگی، اس لئے کہ اگر کوئی مخالف، قرآن شریف میں کوئی ایسا اختلاف پالے جو قرآن شریف کی لفظی دلالت سے حل نہ ہو، تو پھر اس کا کسی اور طریقے سے حل ہونا مثلاً" حدیث رسول کے ذریعے کہ آیت کی مراد یہ نہیں یہ ہے، کوئی اسے مطمئن نہیں کریگا۔ اس لئے کہ وہ تو رسالتِ رسول پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔ بالفاظ دیگر آیات قرآن میں پائے جانے والے اختلاف کا ایسا حل جو قرآنی الفاظ کی دلالت کے بغیر، صرف رسول صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر مبنی ہو صرف ایسے افراد کی تسلی کر سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں' ان کی نبوت اور عصمت پر ایمان رکھتے ہیں۔ حالانکہ آیہ شریفہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا" كَثِیْرًا ان لوگوں سے مخاطب ہے جو آنحضرت کی نبوت اور عصمت پر ایمان نہیں رکھتے اور قرآنی شواہد کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ان کے لئے حجت نہیں ہے۔

دوسری طرف سے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خود قرآن ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر اور بیان کو حجت قرار دیتا ہے اور آنحضرت اپنے اہل بیت کی تفسیر اور بیان کو حجت قرار دیتے ہیں۔

ان دو مقدمات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی بعض آیات دوسری آیات کی تفسیر واقع ہوں' جبکہ قرآن شریف کے مقابل رسول اللہ اور اهل بیت علیہم السلام کا مقام ایسے معصوم معلمین جیسا ہے جو اپنی تعلیم میں ہرگز خطا کے مرتکب نہیں ہوتے۔ قرآنی آیات کی جو تفسیر وہ بیان کریں وہ ہرگز اس تفسیر کے خلاف نہیں ہوسکتی جو آیات قرآن کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر حاصل ہوتی ہے۔

نتیجہ بحث

گزشتہ فصل سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی حقیقی تفسیر وہ ہے جو قرآنی آیات میں تدبر اور قرآنی آیات کی مدد سے حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر قرآنی آیات کی تفسیر میں مندرجہ ذیل تین میں سے ایک راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے:

١ - صرف ان علمی اور غیر علمی مقدمات کی مدد سے تفسیر کرنا جو ہمارے پاس موجود ہیں۔

٢ - آیات کے ذیل میں معصوم سے منقول روایت کی رو سے تفسیر

کرنا۔

۳ - آیت میں تدبر اور اس آیت سے متعلقہ تمام آیات کے معانی اور اگر ممکن ہو تو روایات کی روشنی میں غور و فکر کے ذریعے آیت کی تفسیر کرنا۔

تیسرا راستہ وہی راستہ ہے، جو گزشتہ فصل میں نتیجہ بحث کے طور پر سامنے آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام نے بھی اپنی تعلیمات میں اسی طریقے کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **انما نزل لیصدق بعضہ بعضا** یعنی قرآن شریف اس طرح نازل ہوا کہ اس کے مختلف حصے ایک دوسرے کی تصدیق کریں۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: **ینطق بعضہ ببعض ویشھد بعضہ علی بعض** یعنی قرآن شریف کے مختلف اجزا ایک دوسرے کی مدد سے بولتے ہیں اور ایک دوسرے کے حق میں شہادت دیتے ہیں۔

گزشتہ بیان سے یہ بات واضح ہے کہ اس طریقہ تفسیر کا اس طریقے سے کوئی تعلق نہیں ہے جس سے اس حدیث میں منع کیا گیا ہے کہ: **من فسر القران برایہ فلیتبوا مقعدہ من النار** "جس نے قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کی اس کا ٹھکانہ جنہم ہے"۔ اس لئے کہ اس طریقے کے مطابق قرآن شریف کی تفسیر قرآن شریف سے کی جاتی ہے نہ کہ اپنی ذاتی رائے سے۔

پہلا طریقہ قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس لئے کہ در حقیقت یہ تفسیر بالرائے کی ہی ایک قسم ہے، سوائے ایسی صورت کے کہ وہ تیسرے طریقے سے مطابقت رکھتا ہو۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جو صدر اسلام میں علمائے تفسیر میں رائج تھا (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان ہوچکا ہے)۔ یہ طریقہ اب تک اہل سنت اور

اہل تشیع کے اخباری علما میں رائج ہے۔ یہ طریقہ لا محدود ضرورتوں کی تکمیل کے لئے بہت ہی محدود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھ ہزار سے زائد قرآنی آیات کے ذیل میں سینکڑوں اور ہزاروں سوالات پائے جاتے ہیں۔ ان سوالات اور پیچیدگیوں کا جواب اور حل کہاں سے لیا جائے؟ آیا روایات کی طرف رجوع کیا جائے؟ مگر صورتحال یہ ہے کہ روایات نبوی کے نام پر جو کچھ اہل سنت کے ذرائع سے ہمارے پاس موجود ہے ان کی تعداد دو سو پچاس سے بھی کم ہے جن میں سے بہت سی ضعیف اور غلط ہیں۔ شیعہ ذرائع سے اہل بیت کی روایات کی تعداد اگرچہ ہزاروں میں ہے، جن میں بہت سی معتبر بھی ہیں، لیکن لا محدود سوالات کا جواب دینے کے لئے بہر حال ناکافی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی قرآنی آیات بھی ہیں جن سے متعلق شیعہ اور سنی دونوں کی طرف سے احادیث وارد نہیں ہوئی ہیں۔

یا یہ کہ ان مشکلات اور سوالات کے حل کے لئے مناسب آیات کی طرف رجوع کیا جائے؟ جو کہ اس طریقے میں ممنوع ہے۔ یا یہ کہ بحث سے اجتناب کیا جائے اور ان علمی ضروریات کو نظر انداز کردیا جائے؟ ایسی صورت میں ان آیات کا کیا مفہوم رہ جائے گا:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل : ۸۹)

ترجمہ : اور ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی جو ہر شے کو بیان کرتی ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (نسا : ۸۲)

ترجمہ : کیا یہ قرآن شریف میں تدبر نہیں کرتے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص : ۲۹)

ترجمہ : ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی جو مبارک ہے تاکہ یہ اس

کی آیات میں تدبر کریں اور صاحبان عقل نصیحت حاصل کریں۔

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَاءَ هُمْ مَالَمْ يَاْتِ اٰبَائَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۔

(مومنون : ٦٧)

ترجمہ : آیا انہوں نے اس بات میں تدبر نہیں کیا' یا یہ کہ ان کے پاس کوئی ایسی بات آئی ہے جو ان کے گزشتہ آباء و اجداد کے پاس نہیں آئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین کی جن مسلمہ احادیث(۴۶) میں لوگوں کو پرزور تاکید کی گئی ہے کہ مشکلات اور فتنوں میں قرآن شریف کی طرف رجوع کریں' ان کا کیا نتیجہ ہو گا؟

اس طریقے کی رو سے تدبر فی القرآن جو کہ بہت سی آیات کی روشنی میں ایک عمومی فریضہ ہے، اس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اسی طرح اہل سنت کی روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل تشیع کی رسول اللہ اور آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین سے مروی متواتر(۴۷) احادیث میں احادیث کی صحت جانچنے کے لئے ان کا قرآن شریف کی روشنی میں جائزہ لینا ایک فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں' اگر حدیث قرآن کے مطابق ہو تو اس کو قبول کرکے اس پر عمل کرنا چاہئے اور اگر خلاف قرآن ہو تو اسے رد کردیا جائے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ان احادیث کا مضمون اسی صورت میں درست ہو گا جب قرآنی آیات اپنے مطالب پر دلالت کرتی ہوں اور ان کا مدلول (مطلب) جو کہ آیت کی تفسیر ہے' معتبر ہو۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آیات کے مطالب کو حدیث ہی بیان کرسکتی ہے تو اس صورت میں احادیث کا

قرآن شریف پر پیش کرنا ایک مہمل اور بے معنی سی بات ہوگی۔

یہ احادیث اس بات کی بہترین گواہ ہیں کہ ہر کلام کی طرح قرآن شریف کی آیات بھی اپنی معانی پر دلالت کرتی ہیں اور روایات سے قطع نظر، ان کی دلالت استقلالی طور پر حجت ہے۔

گزشتہ بحوث سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مفسر پر فرض ہے کہ رسول اللہ اور آئمہ معصومین علیہم السلام سے تفسیر قرآن کے سلسلے میں مروی روایات میں خوب غور و فکر کرے، ان کی روش سے آگاہی حاصل کرے اور اس کے بعد قرآن و سنت کے حکم کے مطابق قرآن شریف کی تفسیر کرے اور جو روایات آیت کے مضمون کے ساتھ ھماھنگ ھوں انہیں قبول کرے۔

تفسیر قرآن بالقرآن کا ایک نمونہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں متعدد مقامات پر فرمایا ہے:

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (زمر : ۶۲)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔

یہ مضمون قرآن مجید میں چار بار دہرایا گیا ہے۔ اس کی رو سے کائنات میں جو بھی چیز فرض کی جاسکے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

البتہ اس نکتے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ قرآن شریف نے سینکڑوں آیات میں علیت ور معلولیت کی تصدیق کی ہے اور ہر فعل کو اس کے فاعل کی طرف نسبت دی ہے۔ اشیاء کے آثار کا ماخذ انہی کو قرار دیتا ہے مثلاً" آگ کا جلانا، زمین کا اگانا اور آسمان کا پانی برسانا۔ اسی طرح انسان کے اختیاری افعال کو بھی انسان کے حساب میں لکھتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ ہر کام کو انجام دینے والا ہی اس کا فاعل ہے لیکن اس کام کو ھستی اور وجود عطا کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ ہے اور بس۔

دائرہ تخلیق کو یہ وسعت اور عمومیت دینے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ (الم سجدہ : ۷)

ترجمہ : وہی ہے جس نے اپنی پیداہ کردہ ہر چیز کو احسن قرار دیا۔

اس آیت کو گزشتہ آیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ معنی حاصل ہوں گے کہ حسن اور خلقت ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ہیں۔ کائنات میں جو بھی چیز وجود رکھتی ہے حسین ہے اور حسن کے علاوہ اس کی کوئی صفت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس نکتے سے بھی غفلت نہیں کرنی چاہئے کہ قرآن شریف میں بہت سی آیات میں خیر کو شر' فائدے کو ضرر' اچھے کو برے اور خوبصورت کو بدصورت کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جو نکتہ یہاں پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام برائیاں' قباحتیں اور ناگواریاں قیاس اور موازنہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کا وجود قیاسی اور نسبی ہے نہ کہ نفسی یا ذاتی۔ مثلاً" سانپ اور بچھو برے ہیں لیکن انسانوں اور ان حیوانات کے لئے جو ان کے ڈسنے سے نقصان اٹھاتے ہیں نہ کہ پتھر اور خاک کے لئے۔ تلخ ذائقہ اور مردار کی بدبو قابل نفرت ہیں لیکن انسان کی قوت ذائقہ اور شامہ کے لئے' نہ کہ سب کے لئے۔ بعض اعمال اور کردار برے ہیں لیکن انسانی معاشرتی نظام کے لئے' نہ کہ ہر نظام کے لئے۔ علاوہ ازیں اگر ہر قسم کے معاشرتی نظام کو نظر انداز کردیا جائے تو اس صورت میں بھی یہ اعمال و کردار برے نہیں ہوں گے۔

بے شک اگر ذرا سی دیر کے لئے موازنہ و مقایسہ کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو جس چیز پر بھی نظر ڈالیں' ایک خوبصورت پیکر اور آنکھوں کو چندھیا دینے والے حیرت انگیز وجود کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ عالم وجود کا حسن و جمال ناقابل بیان ہے اس لئے کہ توصیف و بیان خود بھی عالم وجود کے جمال کا حصہ ہیں۔

درحقیقت مذکورہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی نظر کو نسبی اور قیاسی اچھائی اور برائی سے جمالِ مطلق کی طرف پھیر دے اور فہم و ادراک کو کلی اور عمومی نقطہ نظر سے بہرہ مند کردے۔

یہ جان لینے کے بعد ہم سینکڑوں ایسی قرآنی آیات کو دیکھتے ہیں جو مختلف بیانات کے ذریعے تمام موجودات عالم کو، تنہا تنہا اور گروہ گروہ، اور ان پر حاکم جزئی اور کلی نظاموں کو اللہ تعالیٰ کی آیت اور نشانی کے طور پر متعارف کراتی ہیں اور جس لحاظ سے بھی فرض کیا جائے (صحیح غور کریں) انہیں اللہ تعالیٰ کی نشانی قرار دیتی ہیں۔

گزشتہ دو آیات کی روشنی میں ان بیانات سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حیرت انگیز جمال اور زیبائی، جس نے سارے عالم کو دو طرف سے ڈھانپا ہوا ہے، دراصل جمال الٰہی ہے جو زمینی اور آسمانی آیات کے ذریعے قابل مشاہدہ ہے۔ کائنات کا ہر جزو ایک ایسا دروازہ ہے جو اپنے سے باہر کی لا متناہی اور دلنشین فضا کے کچھ حصے کو دکھاتا ہے اور اپنی ذات میں کچھ نہیں رکھتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کی دوسری آیات ہر جمال و کمال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الْحَیُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (مومن : ۶۵)

ترجمہ : وہی زندہ ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا (بقرہ : ۱۶۵)

ترجمہ : بے شک تمام قوت اللہ تعالیٰ کی ہے۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا (نسا : ۱۳۹)

ترجمہ : بے شک تمام عزت اللہ تعالیٰ کی ہے۔

وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْر

ترجمہ : اور وہ بڑا جاننے والا اور قدرت والا ہے۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْر

ترجمہ : اور وہ بڑا سننے اور دیکھنے والا ہے۔

اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (طہ : ۸)

ترجمہ : اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے' اسی کے خوبصورت نام ہیں۔

ان تمام آیات کی رو سے' عالم ہستی میں جلوہ گر ہر زیبائی درحقیقت اللہ تعالٰی کی طرف سے ہے۔ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے' وہ مجاز اور استعارہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس بیان کی تاکید میں قرآن شریف ایک اور بیان کے ذریعے اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ عالم ہستی کے تمام مخلوقات کے پاس جو بھی کمال و جمال ہے وہ محدود اور متناہی ہے' جبکہ لا محدود اور لا متناہی کمال و جمال اللہ تعالٰی کے پاس ہے:۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (قمر : ۴۹)

ترجمہ : ہم نے ہر چیز کو اندازے کے مطابق پیدا کیا۔

وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُوْمٍ (حجر :۲۱)

ترجمہ : اور جو بھی چیز ہے اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اسے مقررہ اندازے کے مطابق نازل کرتے ہیں۔

اس قرآنی حقیقت کو تسلیم کرکے انسان یکایک اپنے آپ کو ایک ایسے لا محدود کمال و جمال کے سامنے پاتا ہے جو ہر طرف سے اس پر محیط ہے اور جس کے مقابل کوئی خلا موجود نہیں ہے۔ اس مرحلے پر انسان ہر جمال و کمال کو' حتی کہ اپنے آپ کو بھی' جو کہ اس کی ایک نشانی ہے' بھول کر اس کا عاشق اور گرویدہ ہو جاتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ : ١٦٥)

ترجمہ : اور جو لوگ ایمان لائے وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔

اور جیسا کہ مہر و محبت کا تقاضا ہے' اس مرحلے پر انسان اپنے استقلال اور ارادہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرکے اس کی ولایت مطلقہ کی سر پرستی میں آجاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن شریف ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران : ٦٨)

ترجمہ : اور اللہ تعالیٰ مومنین کا ولی (سرپرست) ہے۔

اللہ تعالیٰ بھی حسب وعدہ اس کی رہنمائی اور اس کے امور کی کفالت فرماتا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

ترجمہ : اللہ تعالیٰ مومنین کا ولی ہے۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے۔ (بقرہ: ٢٥٧)

مندرجہ ذیل آیات کریمہ کی رو سے انہیں ایک نئی روح اور زندگی اور نور (حقیقت بینی کی خاص قوت) مقرر فرماتا ہے جن کی مدد سے وہ معاشرے میں سعادتمندانہ زندگی کی راہ کو پہچان لیتا ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ (انعام : ١٢٢)

ترجمہ : اور وہ جو مردہ تھا پس ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ

ترجمہ : انہی کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو پختہ کردیا اور اپنی طرف سے ایک روح سے ان کی مدد کی۔ (مجادلہ: ۲۲)

ایک اور آیت میں اس نور کے حصول کی راہ بھی دکھلا دی:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَحْمَتِهٖ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (حدید : ۲۸)

ترجمہ : اے اھل ایمان اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ وہ اپنی رحمت سے تمہیں دوگنا حصہ دے گا اور تمہارے لئے ایک نور قرار دے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے۔

بعض دوسری آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس سے مراد آنحضرت کی اتباع ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۱)

ترجمہ : کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

جن چیزوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع ضروری ہے انہیں اس طرح بیان فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (اعراف : ۱۵۷)

ترجمہ : جو اتباع کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ انہیں اچھائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو ان پر حلال اور پلید چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے اور ان سے ان کی سختی اور ان زنجیروں کو

جو ان پر تھیں اتار دیتا ہے۔

اس سلسلے میں اس سے زیادہ واضح آیت، جو اس آیت کی مفسر بھی ہے، یہ ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفاً فِطْرَۃَاللّٰہِ الَّتِیْ فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم (روم : ۳۰)

ترجمہ : اپنا چہرہ دین کے لئے قائم کردے، اعتدال کے ساتھ، جو وہی اللہ تعالیٰ کا انداز تخلیق ہے جس پر اس نے لوگوں کو خلق کیا، اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے، یہی وہ دین ہے جو انسانی معاشرے کی سرپرستی کرسکتا ہے۔

اس آیہ شریفہ کی رو سے اسلام کا سارا دستور العمل فطری تقاضوں پر مبنی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دین اسلام سے مراد وہ اصول و قوانین ہیں جن کی طرف انسانی فطرت رہنمائی کرتی ہے، یعنی ایک پاکیزہ طبیعی زندگی۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

وَنفسٍ وَمَا سَوّاھَا فَاَلْھَمَھَا فجورَھَا وَتقوَاھَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھا وَقدْ خابَ مَنْ دَسّٰھَا (الشمس : ۷، ۸)

ترجمہ : اور قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے مناسب پیدا کیا۔ پھر اسے فجور اور تقوا سے آشنا کیا۔ یقیناً" وہ شخص فلاح پاگیا جس نے اس (نفس) کو پاک کیا اور جس نے اسے آلودہ کردیا وہ ہلاک ہوگیا۔

قرآن شریف واحد آسمانی کتاب ہے جو:

۱ - سعادتمندانہ انسانی زندگی کو ایک فطری انسان کی پاکیزہ اور بے آلائش زندگی کے مساوی قرار دیتی ہے۔

۲ - ان راہوں میں سے اکثر یاسب کی نفی کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بندگی کو عام انسانی زندگی سے جدا سمجھتی ہیں۔

قرآن شریف انسانی زندگی کے دستور العمل کو ہی دینی دستور العمل

قرار دیتا ہے اور انسان کی فردی اور معاشرتی زندگی کے تمام شعبوں میں حقیقت (حقیقی جہان شناسی اور خدا شناسی) پر مبنی احکام صادر کرتے ہوئے انسان کو کائنات کے اور کائنات کو انسان کے سپرد کردیتا ہے اور ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیتا ہے۔

قرآن شریف مردان الٰہی اور اولیائے حق کے مقام یقین کے بارے میں بہت سے ظاہری اور معنوی آثار و خواص بیان کرتا ہے جن کی تشریح و تفصیل کی اس فصل میں گنجائش نہیں ہے۔

☆ رسول اللہ اور آئمہ علیہم السلام کے ارشادات کے حجت ہونے کے معنی

جیسا کہ گزشتہ فصول میں بیان ہوچکا ہے خود قرآن شریف کی دلالت کی رو سے رسول اللہ اور آئمہ علیہم السلام کے ارشادات تفسیر قرآن میں حجت ہیں۔ یہ حجیت رسول اللہ اور آئمہ علیہم السلام کے زبانی اور صریح اقوال اور ان روایات میں تو واضح ہے جن کا ان بزرگ ہستیوں سے صادر ہونا یقینی اور قطعی ہے۔ لیکن وہ غیر قطعی احادیث جنہیں اصطلاح میں خبر واحد کہا جاتا ہے' ان کی حجیت پر مسلمانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں مفسر کی اپنی رائے ہی معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ اہل سنت میں عموماً" ایسی خبر واحد پر جسے اصطلاح میں صحیح کہا جاتا ہے عمل کیا جاتا ہے۔ جہاں تک اھل تشیع کا تعلق ہے تو جو کچھ عصر حاضر میں علمِ اصول میں تقریباً" مسلم ہے وہ یہ کہ ایسی خبر واحد جو موثوق الصدور ہو' احکام شرعیہ میں حجت ہے مگر غیر احکام شرعیہ میں معتبر نہیں ہے۔ مزید تحقیق کے لئے علم اصول کی طرف رجوع کریں۔

یاد آوری

اس اساس پر کہ تفسیر سے مراد آیت کے معنی ہیں صرف اسی بحث کو تفسیری بحث کہا جاسکتاہے جو آیات کے معانی کے حصول میں موثر ہو۔ لیکن

وہ ابحاث جو یہ اثر نہیں رکھتی ہیں مثلاً" بعض لغوی' قرائتی اور بدیعی ابحاث' تفسیر قرآن میں شمار نہیں کی جاسکتی ہیں۔

حواشی

۱۔ مثلاً" یا ایہا الذین کفروا' یا اھل الکتاب' یا بنی اسرائیل اور یا ایہا الناس وغیرہ کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔

۲۔ تفسیر صافی مقدمہ نمبر ۸ اور سفینتہ البحار مادہ "بطن"

۳۔ بحار الانوار ج ۱ ص ۳۷

۴۔ تفسیر عیاشی ج ۱ ص ۱۶ تفسیر قمی سورہ بقرہ کی ابتدا۔ نور الثقلین ج ۱ ص ۳

۵۔ درالمنثور ج ۲ ص ۸ ۶۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۱ ۷۔ تفسیر عیاشی ج ۱ ص ۱۶۲

۸۔ عیون اخبار الرضا ج ۱ ص ۲۹۰

۹۔ اس لئے کہ تاویلی معانی بیان کرنا اور ساتھ ہی یہ عقیدہ رکھنا کہ تاویلی معانی کا اللہ تعالٰی کے علاوہ کسی کو علم نہیں ہے ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن یہ احتمال کے طور پر انکا ذکر کرتے ہیں۔

۱۰۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب سورہ یوسف کی تیسری آیت میں مذکور ہے (جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا : ابا جان! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے' سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں) اس خواب کی تاویل آیت نمبر ۱۰۰ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی نقل کی گئی ہے۔ (برسوں کی جدائی کے بعد جب حضرت یوسف کے ماں باپ اور بھائی مصر پہنچے تو حضرت یوسف انہیں تخت پر لے گئے اور ان کے ماں باپ اور بھائی ان کے سامنے سجدے میں گر پڑے تو انہوں نے کہا : ابا جان! یہ میرے خواب کی تاویل ہے)

بادشاہ مصر کا خواب آیت نمبر ۴۴ میں مذکور ہے (بادشاہ نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات دبلی گائیں سات موٹی گائیوں کو کھا رہی ہیں اور سات

سبز خوشے اور سات خشک خوشے) اس خواب کی تاویل حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی آیات ۴۷ - ۴۹ میں بیان ہوئی ہے (یوسف نے کہا: سات سال تم اپنی ساری محنت سے غلہ اگاؤ گے اور جو فصل کاٹو گے اسے خوشوں میں ہی رہنے دینا سوائے تھوڑی سی مقدار کے جو تم کھاؤ گے۔ اس کے بعد سات سال سختی کے آئیں گے جو تمہارا سابقہ ذخیرہ کھائیں گے سوائے تھوڑی سے مقدار کے جسے تم بچا کر رکھو گے اس کے بعد جو سال آئے گا اس میں لوگوں کے لئے بارش برسے گی)

زندان میں حضرت یوسف کے ساتھیوں کا خواب آیت نمبر ۳۶ میں مذکور ہے (یوسف دو جوانوں کے ساتھ زندان میں داخل ہوئے ان میں سے ایک نے کہا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں انگور نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا: میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیاں ہیں جنہیں پرندے کھا رہے ہیں)

ان خوابوں کی تاویل آیت ۴۱ میں حضرت یوسف کی زبانی بیان ہوئی ہے (اے میرے دو قیدی ساتھیو! تم میں سے ایک بادشاہ کا ساقی بن جائے گا اور دوسرے کو پھانسی دیدی جائے گی اور پرندے اس کے سر سے نوچ کر کھائیں گے)

۱۱۔ تفسیر عیاشی مطبوعہ قم ج ۱ ص ۱۰

۱۲۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے مطابق عمل کریں گے تو فائدہ پائیں گے اور اگر مخالفت کریں گے یہ ان کے لئے نقصان دہ ہوگا (مترجم)

۱۳۔ تفسیر عیاشی مطبوعہ قم ج ۱ ص ۱۱ روایت فضیل از امام محمد باقر علیہ السلام۔

۱۴۔ الاتقان از علامہ سیوطی مطبوعہ مصر کا آخری حصہ ملاحظہ ہو۔

۱۵۔ اتقان ص ۱۲۰ - ۱۳۲

۱۶۔ مجاہد: مشہور مفسر جن کا ۱۰۰ یا ۱۰۳ ہجری میں انتقال ہوا۔ (تہذیب الاسماء نووی) سعید بن جبیر مشہور مفسر ابن عباس کے شاگرد تھے۔ ۹۴ ہجری میں حجاج کے ہاتھوں شہید ہوئے (تہذیب) عکرمہ، ابن عباس کے آزاد کردہ غلام اور شاگرد تھے۔ یہ سعید بن جبیر کے بھی شاگرد تھے۔ ۱۰۴ ہجری میں فوت ہوئے (تہذیب)

ضحاک عکرمہ کے شاگرد تھے۔ (لسان المیزان) حسن بصری مشہور مفسر اور زاہد ۱۱۰ ہجری میں فوت ہوئے (تہذیب) عطا بن ابی رباح مشہور فقیہہ اور مفسر ابن عباس کے شاگرد تھے۔ ۱۱۶ ہجری میں وفات پائی (تہذیب) ابوالعالیہ آئمہ تفسیر اور تابعین بزرگ میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کا تعلق پہلی صدی ہجری سے تھا (تہذیب) محمد بن کعب قرظبی معروف مفسر یہود بنی قریظہ کی نسل سے تھے۔ ان کا تعلق پہلی ہجری صدی سے تھا۔ قتادہ بزرگان تفسیر میں شمار ہوتے تھے، حسن بصری اور عکرمہ کے شاگرد تھے۔ ۱۱۷ ہجری میں وفات پائی (تہذیب) عطیہ، ابن عباس سے نقل کرتے تھے۔ (لسان المیزان) زید بن اسلم حضرت عمر کے آزاد کردہ غلام ۱۳۶ ہجری میں فوت ہوئے (تہذیب) طاؤس یمانی اپنے زمانے کے علماء میں سے تھے۔ یہ ابن عباس کے شاگرد تھے اور ۱۰۶ ہجری میں فوت ہوئے۔ (تہذیب)

۱۷۔ ابو صالح کلبی علمائے انساب میں سے تھے اور مفسر تھے۔ ان کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے۔

۱۸۔ روایات موقوفہ سے مراد وہ روایات ہیں جن میں اس شخص کا ذکر نہ ہو جس سے روایت نقل کی گئی ہے۔

۱۹۔ سفیان بن عینیہ مکی تابعین کے دوسرے طبقہ اور علمائے تفسیر میں سے ہیں ان کی وفات ۱۹۸ ہجری میں ہوئی (تہذیب)

۲۰۔ وکیع بن جراح کوفی بھی تابعین کے دوسرے طبقہ کے مفسر ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۷ ہجری میں ہوا۔ (تہذیب)

۲۱۔ شعبہ بن حجاج بصری دوسرے طبقہ کے معروف مفسر ہیں۔ انہوں نے ۱۶۰ ہجری میں وفات پائی۔

۲۲۔ عبد بن حمید تابعین کے دوسرے طبقہ کے صاحب تفسیر ہیں۔ ان کا زمانہ حیات دوسری صدی ہجری ہے۔

۲۳۔ محمد بن جریر بن یزید اہل سنت کے مشہور عالم تھے جن کا انتقال ۳۱۰ ہجری میں ہوا (لسان المیزان)

۲۴۔ اتقان از علامہ سیوطی ج ۲ ص ۱۹۰

۲۵۔ زجاج متوفی ۳۱۰ ہجری' واحدی متوفی ۴۶۸ ہجری اور ابو حیان متوفی ۷۴۵ ہجری۔ (ریحانہ

۲۶۔ زمخشری علمائے ادب میں معروف مقام رکھتے ہیں۔ ۵۳۸ ہجری میں وفات پائی (کشف الظنون)

۲۷} فخر رازی معروف مفسر اور متکلم' صاحب تفسیر مفاتیح الغیب۔ ۶۰۶ ہجری میں فوت ہوئے۔ (کشف الظنون)

۲۸} عبدالرزاق کاشی آٹھویں صدی کے معروف عالم اور عارف۔ ۷۲۰ یا ۷۵۱ ہجری میں فوت ہوئے۔ (ریحانہ)

۲۹} احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی۔ ۴۲۶ یا ۴۲۷ ہجری میں فوت ہوئے۔ (ریحانہ)

۳۰} محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی۔ ۶۶۸ ہجری میں وفات پائی (ریحانہ)

۳۱} تفسیر روح البیان شیخ اسماعیل حقی اسلامبولی کی تالیف ہے جنہوں نے ۱۱۳۷ ہجری میں وفات پائی (ملحقات کشف الظنون)

۳۲} روح المعانی شہاب الدین محمود آلوسی نے تالیف کی۔ انہوں نے ۱۲۷۰ ہجری میں وفات پائی۔ (ملحقات کشف الظنون)

۳۳} نظام الدین حسن قمی نیشاپوری کی تفسیر غرائب القرآن' نیشاپوری کا انتقال ۷۲۸ ہجری میں ہوا۔ (ملحقات کشف الظنون)

۳۴} اصول سے مراد وہ کتب ہیں جن میں اصحاب آئمہ' آئمہ کے ارشادات ثبت کرلیتے تھے۔ بالفاظ دیگر انہیں ایک قسم کی نوٹ بک کہا جاسکتا ہے۔ (مترجم)

۳۵} زرارہ اور محمد بن مسلم دونوں شیعہ فقہا اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے اصحاب خاص میں سے ہیں۔ معروف اور جریر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب خاص میں سے ہیں۔

۳۶} فرات بن ابراہیم کوفی صاحب تفسیر ہیں۔ (ریحانہ) ابو حمزہ ثمالی شیعہ فقیہ اور امام سجاد اور امام محمد باقر علیہما السلام کے اصحاب خاص میں سے ہیں۔

۳۷} محمد بن مسعود کوفی سمرقندی عیاشی سرکردہ شیعہ علما میں سے تھے ان کا زمانہ حیات تیسری صدی کا دوسرا نصف ہے۔ (ریحانہ)

۳۸} علی بن ابراہیم قمی مشائخ حدیث میں ہیں۔ چوتھی صدی کے اوائل میں وفات پائی۔ (ریحانہ)

۳۹} محمد بن ابراہیم نعمانی معروف شیعہ عالم اور کلینی کے شاگرد تھے۔ چوتھی صدی کے اوائل میں زندگی گزاری۔ (ریحانہ)

۴۰} سید رضی سرکردہ شیعہ علماء میں سے تھے اور اپنے دور میں شعر و ادب میں یکتائے روزگار تھے۔ نہج البلاغہ انہی کی تالیف ہے۔ ۴۰۴ یا ۴۰۶ ہجری میں وفات پائی۔ (ریحانہ)

۴۱} شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی اکابر علمائے امامیہ میں سے تھے۔ آپ کی دو تالیفات تہذیب الاحکام اور استبصار کتب اربعہ میں شامل ہیں۔ آپ نے ۴۶۰ ہجری میں وفات پائی۔ (ریحانہ)

۴۲} صدر المتالہین محمد بن ابراہیم شیرازی معروف فلسفی ۱۰۵۰ ہجری میں فوت ہوئے۔ اسرار الآیات اور تفاسیر کے ایک مجموعہ کے مولف ہیں۔ (روضات اور ریحانہ)

سید ہاشم بحرانی کی تفسیر البرہان چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ کا انتقال ۱۱۰۷ ہجری میں ہوا۔ محسن فیض کاشانی صاحب تفسیر صافی ۱۰۹۱ ہجری میں فوت ہوئے (ریحانہ)

۴۳} شیخ عبد علی حویزی کی تفسیر نور الثقلین پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ کا انتقال ۱۱۱۲ ہجری میں ہوا (ریحانہ)

۴۴} فضل بن حسن طبرسی سرکردہ شیعہ عالم تھے۔ آپ کی تفسیر مجمع البیان دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ کا انتقال ۵۴۸ ہجری میں ہوا۔ (ریحانہ)

۴۵} سورہ نساء :۸۲

۴۶} تفسیر عیاشی، تفسیر صافی، تفسیر برہان اور بحار الانوار کے آغاز کی طرف

رجوع کریں۔

۴۷} بحار الانوار ج ۱ ۔ ص ۱۳۷ ۔ باب اختلاف اخبار۔

تیسرا باب

وحی قرآن

اس باب میں مندرجہ ذیل عناوین زیر بحث لائے گئے ہیں۔

ا وحی قرآن سے متعلق مسلمانوں کا عمومی عقیدہ۔

ب وحی و نبوت سے متعلق دور حاضر کے مصنفین کا نظریہ

ج قرآن مجید اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

۱ - کلام خدا

۲ - روح امین اور جبرئیل۔

۳ - ملائکہ اور شیاطین

۴ - ضمیر کی آواز

۵ - دوسری توجیہ کے بارے میں

د خود قرآن شریف وحی و نبوت کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

۱ - عام ہدایت اور انسانوں کی ہدایت

۲ - زندگی کی راہ میں انسان کی امتیازی حیثیت

۳ - نوع انسانی کے معاشرتی ہونے کے کیا معنی ہیں؟

۴ - اختلافات کا ظہور اور قانون کی ضرورت

۵ - قانون کی طرف رہنمائی کے لئے عقل کافی نہیں ہے۔

۶ - انسان کی ہدایت کا راستہ صرف وحی ہے۔

۷ - اعتراض اور جواب۔

۸ - وحی کا راستہ خطا سے پاک ہے۔

۹ - حقیقت وحی ہم پر مجہول ہے۔

۱۰ - وحی قرآن مجید کی کیفیت۔

الف - وحی قرآن سے متعلق مسلمانوں کا عمومی عقیدہ

قرآن مجید نے دوسری تمام مقدس کتابوں سے بڑھ کر آسمانی وحی، وحی کے بھیجنے والے، وحی کے لانے والے، یہاں تک کہ وحی کی کیفیت کے بارے میں بیان کیا ہے۔

وحی قرآن سے متعلق مسلمانوں کا عمومی عقیدہ، جس کی بنیاد قرآن شریف کے ظاہری معنی ہیں، یہ ہے کہ قرآن مجید اپنے الفاظ سمیت کلام خدا ہے جسے ملائکہ، جو کہ ایک آسمانی مخلوق ہیں، میں سے ایک مقرب فرشتے کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے۔ اس فرشتے نے، جس کا نام جبرئیل اور روح امین ہے، بتدریج تیئس سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ کے کلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچایا جس کی رو سے آنحضرت کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ان آیات کے الفاظ پڑھ کر لوگوں کو سنائیں، انہیں ان کے معنی سمجھائیں اور انہیں قرآن مجید کے بیان کردہ اعتقادی مفاہیم اور انفرادی اور معاشرتی قوانین کی طرف دعوت دیں۔ اس الٰہی ذمہ داری کا نام رسالت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پیغام کو کسی تصرف و دخالت یا کمی و بیشی اور پس و پیش کے بغیر انسانوں تک پہنچانے کے فریضہ کو ادا کیا۔

ب - وحی و نبوت سے متعلق دور حاضر کے مصنّفین کا نظریہ

ادیان و مذاہب کے بارے میں تحقیق اور مطالعہ کرنے والے دور حاضر کے اکثر مصنّفین کا وحی، نبوت اور قرآن شریف کے بارے میں نظریہ یہ ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل معاشرتی شخصیت تھے جو انسانی معاشرے کو پستی اور زوال کے گڑھے سے نجات دے کر تمدن اور آزادی کی منزل سے ہمکنار کرنے کے لئے اٹھے۔

انہوں نے معاشرے کو اپنے ان پاکیزہ افکار کی طرف دعوت دی جنہیں انہوں نے ایک کامل اور جامع دین کی شکل میں منظم کیا تھا۔ وہ ایک پاکیزہ روح اور بلند ہمت کے مالک تھے اور ایک ایسے معاشرے میں رہتے تھے جہاں ظلم، بیہودگی اور بد نظمی کی حکومت تھی، جہاں تکبر، چوری چکاری، ڈاکہ زنی اور ہر قسم کی بربریت کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

ان تمام ناگواریوں کو دیکھ کر آپؐ رنجیدہ رہتے اور جب کرب کی شدت بہت بڑھ جاتی تو لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر تہامہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کی غار میں چلے جاتے۔ آپ چند روز یہاں رہتے اور زمین، آسمان، ستاروں، پہاڑوں، دریاؤں، صحراؤں اور ایسے ہی بہت سے گرانقدر وسائل کا جو کارخانہ قدرت نے انسان کی نظروں کے سامنے قرار دیئے ہیں، گہرا مشاہدہ کرتے اور انسان کے دامن گیر ہوجانیوالی اس جہالت اور غفلت پر افسوس کرتے جس نے انسان کی سعادتمندانہ زندگی کو حیوانوں کی زندگی میں تبدیل کردیا تھا۔ چالیس سال کی عمر تک آپ اسی رنج و الم کی حالت میں رہے۔ جب آپ کی عمر چالیس سال ہوگئی تو آپ ایک ایسا منصوبہ بنانے میں کامیاب ہوگئے جو لوگوں کو اس پستی اور تاریکی سے نجات دے سکے۔ یہ منصوبہ دین اسلام تھا جو اس وقت کے لحاظ سے مناسب ترین نظام تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پاکیزہ افکار کو کلام خدا اور وحی الٰہی سمجھتے تھے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاکیزہ باطن کی راہ سے ان سے گفتگو کی ہے۔ آپ اپنی پاکیزہ روح کو، جس میں سے یہ پاکیزہ افکار آپ کے قلب پر اترتے تھے، جبرئیل اور روح امین کا نام دیتے اور مجموعی طور پر عالم طبیعت کی ان تمام طاقتوں کو جو نیکی اور بھلائی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں ملائکہ کا نام دیا جبکہ برائی اور بدبختی کی طرف مائل کرنے والی طاقتوں کو شیاطین اور جن قرار دیا اور اپنے ضمیر کی آواز پر

جو فریضہ آپ نے اپنے ذمے لیا تھا اسے رسالت اور نبوت کا نام دیا۔

البتہ یہ توجیہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جو کائنات کے خالق کو تسلیم کرتے ہیں اور اپنی انصاف پسندی کی بنیاد پر دین اسلام کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ کائنات کے خالق پر ایمان نہیں رکھتے، وہ وحی، نبوت، آسمانی فرائض، ثواب و عقاب اور جنت و جہنم کو ایک ایسی دینی سیاست قرار دیتے ہیں جو درحقیقت ایک مصلحت آمیز جھوٹ ہے، ـــ ان کا کہنا ہے کہ انبیاء اصلاح پسند لوگ تھے جو انسانی معاشرے کی اصلاح کے لئے دین کی صورت میں کچھ قوانین لائے۔ چونکہ اس زمانے کے لوگ ظلمت، جہالت اور توہم پرستی میں غرق تھے۔ لہٰذا انبیاء نے دینی نظم و نسق کو خدا اور آخرت جیسے توہم پرستانہ عقائد کے سائے میں قائم رکھا۔

ج ـ قرآن شریف اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

وحی و نبوت سے متعلق گزشتہ دو توجیہات میں سے پہلی توجیہ ان دانشمندوں کی طرف سے ہے جو مادی اور طبیعی علوم سے مانوس ہونے کی وجہ سے عالم ہستی کی ہر چیز کو طبیعی قوانین میں محدود سمجھتے ہیں اور تمام واقعات کا سرچشمہ طبیعت (NATURE) کو قرار دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک قدرتی سی بات ہے کہ وہ آسمانی ادیان کو بھی معاشرتی واقعات سے تعبیر کرتے ہوئے انہیں معاشرتی معیاروں کی روشنی میں ہی جانچیں گے۔ اگر کوروش، داریوش اور سکندر جیسے افراد بھی اپنے آپ کو خدا کا رسول اور اپنے کاموں کو رسالت کا نام دیتے اور اپنے فیصلوں کو خدائی فیصلے قرار دیتے تو یہ دانشمند ان کی بھی یہی توجیہ کرتے جو گزشتہ فصل میں بیان ہو چکی ہے۔

فی الحال ہم عالم ماورائے طبیعت کا وجود ثابت کرنے کے درپے نہیں ہیں اور نہ ہی لان دانشمندوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر علم صرف اپنے

موضوع سے متعلق ہی اظہار نظر کرسکتا ہے اور مادی علوم جو مادہ کے آثار و خواص سے بحث کرتے ہیں انہیں ماورائے مادہ سے متعلق نفی یا اثبات پر مبنی دخالت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ توجیہ جیسی بھی ہو، اسے قرآن مجید کے ساتھ ھماھنگ ہونا چاہئے اس لئے کہ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی سند اور ان تمام باتوں کا اصلی سرچشمہ ہے۔ لیکن قرآن شریف صراحت کے ساتھ اس کی نفی کرتا ہے۔ ہم یہاں پر اس توجیہ کے تمام اجزا کا قرآنی آیات کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔

۱ - کلام خدا

اس توجیہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ذہن میں آنے والے پاکیزہ افکار کو کلام الٰہی کا نام دیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے یہ افکار بھی ان کے دوسرے افکار کی مانند ان کے اپنے ذہن کی پیداوار تھے لیکن ان افکار کو ان کی مخصوص پاکیزگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردیا گیا۔ لہٰذا یہ افکار طبیعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی نسبت اعزازی ہے۔ لیکن قرآن شریف آیات تحدی(۱) میں صراحت اور سختی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور بشر کی طرف اپنی نسبت کو مکمل طور پر نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر یہ بشر(۲) کا کلام ہے تو تم بھی اعتقادیات، اخلاق، احکام، قصص اور حکمت و موعظہ کے شعبوں میں کہ جن سے قرآن شریف بحث کرتا ہے، کوئی کلام بنا کر لے آؤ اور اس سلسلے میں جہاں سے چاہو مدد حاصل کرو۔ مگر جب ایسا نہ کرسکو تو جان لو کہ قرآن کسی بشر کا کلام نہیں ہے۔ اور اگر جن و انس مل کر بھی قرآن کی نظیر اور مثل لانے کی کوشش کریں تو ایسا نہیں کرسکیں گے۔ قرآن شریف کہتا ہے: اگر(۳) تم یہ کہتے ہو کہ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کا کلام ہے تو تم بھی ان جیسے ایک شخص سے، جو یتیم، غیر تربیت یافتہ، ناخواندہ، کتابت نہ سیکھا ہوا اور جاہلیت کی تاریکیوں میں پروان چڑھا ہو، اس کتاب کی ایک یا چند سورتوں جیسی سورت یا سورتیں لے آؤ۔

قرآن شریف کہتا ہے: یہ لوگ قرآنی آیات میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے جو تیئس سال کی مدت میں نازل ہوئیں مگر اس کے باوجود ان کے اسلوب، بیان اور معنی میں کوئی تغیر اور اختلاف واقع نہیں ہوا۔ اگر یہ بشر کا کلام ہوتا تو طبیعی سی بات ہے کہ اس میں تغیر و تبدل اور اختلاف پیدا ہوتا۔

واضح سی بات ہے کہ یہ بیانات اس بات کے ساتھ ہماہنگ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف قرآن شریف کی نسبت اعزازی اور تشریفی ہے، بلکہ یہ بیانات قرآن شریف کو اللہ تعالیٰ کے کلام کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن شریف نے سینکڑوں آیات میں خلاف طبیعت معجزات کا اثبات کیا ہے، جن سے انبیا اپنی نبوت کو ثابت کرتے تھے۔ اگر نبوت ضمیر کی آواز اور آسمانی وحی، پاکیزہ افکار ہی ہوتے تو ایسی صورت میں معجزات سے مدد لینے اور حجت قائم کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

بعض مصنفین ان صریح معجزات کی مضحکہ خیز تاویلات کرتے ہیں لیکن جو بھی ان تاویلات کا مطالعہ کرے اس پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن شریف جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ ان دانشمندوں کے اقوال سے سراسر مختلف ہے۔

ہم اس مقام پر معجزہ یا قرآن شریف کی صحت نقل کے اثبات کے درپے نہیں ہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ قرآن شریف گزشتہ انبیا مثلاً" حضرت صالح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے صریح معجزات

بیان کرتا ہے جو "خرق عادت" (یعنی عام طبیعی قوانین کے بر خلاف) کے علاوہ کوئی معنی نہیں رکھتے اور ضمیر کی آواز کے اثبات کے لئے یقیناً" معجزات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ

(بقرہ : ۹۷)

ترجمہ : کہہ دیجئے جو جبرئیل کا دشمن ہے (وہ جان لے) کہ اس (جبرئیل) نے قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ کے قلب پر نازل کیا۔

یہ آیت یہودیوں کے اس سوال کے جواب میں نازل ہوئی کہ آپ پر کون قرآن شریف کو نازل کرتا ہے؟

آپ نے فرمایا : جبرئیل۔ تو وہ کہنے لگے کہ ہم تو جبرئیل کے دشمن ہیں اس لئے کہ وہی ہم پر پابندیاں نازل کرتا تھا۔ چونکہ ہم اس کے دشمن ہیں لہذا اس کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان نہیں لاتے(۴) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہودیوں کی اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ جبرئیل نے اپنے پاس سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے قرآن شریف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن' جبرئیل کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور لازم ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔

واضح سی بات ہے کہ یہودیوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح سے نہیں بلکہ ایک آسمانی موجود سے دشمنی تھی جو ان پر وحی لے کر آتا تھا۔

یہی قرآن شریف جو اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پر قرآن نازل کرنے کو جبرئیل کی طرف منسوب کرتا ہے یک اور آیت میں اسے روح الامین سے منسوب کرتا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ (شعرا : ۱۹۴)

ترجمہ : اسے روح امین نے آپ کے قلب پر نازل کیا۔

ان دو آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روح امین سے مراد وہی جبرئیل ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر وحی نازل کرنے والے کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ وَلَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ (تکویر ۲۳)

ترجمہ : یہ ایک محترم ایلچی۔ جبرئیل کا قول ہے جو صاحب عرش (خدا) کے ہاں صاحب قوت و مقام ہے۔ وہ فرمانروا ہے (فرشتوں کے ہاں) اور امین ہے۔ اور تمہارا ساتھی۔ (پیغمبر اکرم) دیوانہ نہیں ہے اور اس نے یقیناً وحی لانے والے کو روشن افق پر دیکھا ہے۔

اس آیہ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل مقربان بارگاہ الٰہی میں سے، صاحب قدرت و منزلت اور فرمانروا و امین ہے۔ ایک اور مقام پر ان مقرب فرشتوں کے وصف میں یہ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مومن : ۷)

ترجمہ : وہ جو (تیرے رب کے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں جو ایمان لائے۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ملائکہ مقربین مستقل موجودات ہیں جو شعور و ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ ان کے بیان شدہ اوصاف یعنی اللہ تعالیٰ

پر ایمان لانا اور دوسروں کے لئے مغفرت طلب کرنا صرف مستقل وجود اور شعور و ارادہ رکھنے والی چیز میں پائے جاسکتے ہیں۔

انہی ملائکہ مقربین کے بارے میں مزید ارشاد فرمایا کہ:

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلّٰهِ وَلَا الْمَلٰئِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا" ..... وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا" أَلِيمًا وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا۔

(نساء : ۱۷۳)

ترجمہ : مسیح اللہ تعالیٰ کی بندگی سے سرتابی ہرگز نہیں کریگا اور نہ ہی مقرب فرشتے (ایسا کریں گے) اور جو اس کی بندگی سے سرتابی اور تکبر کریں وہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا...... اور جنہوں نے سرتابی اور تکبر کا ارتکاب کیا وہ انہیں المناک عذاب میں گرفتار کردے گا اور وہ اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا سرپرست اور مددگار نہیں پائیں گے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ مقربین اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے لیکن اس آیت میں انہیں یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر وہ معصیت الٰہی کا ارتکاب کریں گے تو قیامت کے دن عذاب سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو ترک کرنے کی وجہ سے ہونے والا عذاب صرف استقلال وجود اور شعور و ارادہ کے ساتھ ہی صحیح ہوسکتا ہے۔

گزشتہ آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روح امین جسے جبرئیل بھی کہا جاتا ہے' وحی کا لانے والا ہے۔ قرآن شریف کے ارشادات کے مطابق آسمانی فرشتہ مستقل وجود' شعور اور ارادے کا مالک ہے' بلکہ سورہ تکویر کی آیات میں مذکور "مطاع ثم امین" (قرآن کا لانے والا وہاں فرمانروا ہے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل کو عالم بالا میں ایک حاکمیت

اور فرمانروائی حاصل ہے۔ فرشتوں کی ایک جماعت ان کے تابع فرمان ہے اور ہمیشہ یا کبھی کبھار وحی قرآن ان تابع فرشتوں کے ذریعے نازل ہوتی تھی جیسا کہ سورۃ عبس میں ارشاد ہوتا ہے:

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهٗ ۘ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍ بَرَرَةٍ (عبس : ١٦)

ترجمہ : ہرگز نہیں، بے شک یہ قرآن ایک نصیحت ہے۔ پس جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے (یہ نصیحت) مکرم، بلند مرتبہ اور پاکیزہ صحیفوں میں ہے جو نیک اور محترم سفیروں کے ہاتھ میں ہے۔

☆ ملائکہ اور شیاطین

غیر مسلم مفکروں کی مذکورہ توجیہ کے مطابق ملائکہ یا فرشتوں سے مراد وہ طبیعی قوتیں ہیں جو خیر و سعادت کی طرف بلاتی ہیں۔ جبکہ شیاطین ان طبیعی قوتوں کا نام ہے جو برائی اور بدبختی کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ لیکن قرآن مجید کا نقطہ نظر اس کے خلاف ہے۔ قرآن مجید ملائکہ اور شیاطین کو ہمارے دائرہ حواس سے ماورا، مستقل وجود اور صاحب شعور و ارادہ موجودات کی حیثیت سے پہچانتا ہے۔ فرشتوں کے مستقل وجود اور صاحب شعور و ارادہ ہونے پر دلالت کرنے والی کچھ آیات بیان ہو چکی ہیں اور قرآن مجید میں ایسی اور بھی آیات موجود ہیں۔ جہاں تک شیاطین کا تعلق ہے تو ابلیس کا سجدۂ آدم سے انکار اور اللہ تعالٰی کے ساتھ ہونے والی گفتگو، قرآن مجید میں چند مقامات پر مذکور ہے۔ بارگاہ قرب سے دھتکارے جانے کے بعد ابلیس کہتا ہے:

لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (ص : ۸۳)

ترجمہ : تیرے مخلص بندوں کے علاوہ ان سب کو گمراہ کروں گا۔

جواب میں اللہ تعالٰی فرماتا ہے:

لَاَ مْلَئَنَّ جَهنَّمَ مِنکَ وَمِمَّنِ تَبِعَکَ مِنهُمْ اَجْمَعِیْنَ (ص : ۸۴)

ترجمہ : میں۔ تمہارے اعمال کی پاداش میں۔ جنم کو تم اور تمہارے پیروکاروں سے بھر دوں گا۔

ظاہر سی بات ہے کہ سزا پانے والا اگر شعور و ادراک نہ رکھتا ہو تو سزا دینے کا عمل انجام ہی نہیں پاسکتا۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے شیطان کی انسان کو دھمکی کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

وَلَقَدْ صَدَّ قَ اِبْلِیْسَ عَلَیْهِمْ ظَنَّہٗ فَاتَّبَعُوْہُ اِلَّا فَرِیْقاً مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (سبا: ۲۰)

ترجمہ : ابلیس نے ان کے خلاف اپنے گمان کو عملی جامہ پہنا دیا اور مومنین کی ایک جماعت کے علاوہ سب نے اس کی پیروی کی۔

اس آیت میں ابلیس کو ظن اور گمان سے متصف کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

وَقَالَ الشَّیْطَانُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُکُمْ فَاَخْلَفْتُکُمْ وَمَا کَانَ لِیْ عَلَیْکُمْ مِنْ سُلْطَانٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْا اَنْفُسَکُمْ (ابراھیم۲۲)

ترجمہ : اور فیصلہ ہو جانے کے بعد شیطان نے کہا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ سچا وعدہ کیا۔ اور میں نے تم سے وعدہ کرکے وعدہ خلافی کی اور مجھے تم پر کوئی غلبہ حاصل نہیں تھا بلکہ میں نے تمہیں دعوت دی جو تم نے قبول کرلی۔ پس مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت اور سرزنش کرو۔

ملامت اور سرزنش بھی ان امور میں سے ہیں جو صرف شعور اور ارادہ رکھنے والوں سے تعلق پیدا کرسکتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات اور انہی

مضامین پر مشتمل دوسری آیات شیطان کی ایسی صفات اور حالات کو ثابت کرتی ہیں جن کے لئے استقلالی وجود' ارادہ اور شعور کا ہونا لازمی ہے۔ یہ صفات ان طبیعی قوتوں پر صادق نہیں آسکتی ہیں جو مستقل وجود' ارادہ اور شعور سے تہی ہوں۔

☆ جن

جس قسم کی آیات ملائکہ اور شیاطین کے بارے میں مذکور ہوئی ہیں ان جیسی بلکہ ان سے زیادہ اور واضح آیات "جن" کے بارے میں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی اولاد کے بارے میں جو اپنے ماں باپ کی دعوت رد کرتے ہوئے ایمان نہیں لاتے اور احکام الٰہی کو خرافات اور گزرے ہوئے لوگوں کے افسانے قرار دیتے ہیں' فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (احقاف : ۱۸)

ترجمہ : یہی وہ لوگ ہیں جن کے خلاف بات ثابت ہوگئی ان سے گزشتہ جن و انس کی امتوں میں سے' بے شک یہی خسارہ اٹھانے والے تھے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنْصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُسْتَقِيمٍ يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ

(احقاف : ۳۲)

ترجمہ : اور جب ہم نے جنات میں سے کچھ افراد کو قرآن سننے کے لئے آپ کی طرف پھیر دیا۔ جب وہ اس (قرآن) کے پاس پہنچے تو (ایک دوسرے سے) کہنے لگے خاموشی سے سنو۔ پھر جب وہ ختم ہوچکا تو وہ اپنی قوم کو ڈرانے کے لئے واپس ہوئے۔ انہوں نے کہا اے ہماری قوم ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی' گزشتہ کتب کی تصدیق کرتی ہے اور حق اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اے قوم اللہ کی دعوت دینے والے کی بات مان لو اور اس پر ایمان لے آؤ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے محفوظ کردے گا۔ اور جو اللہ کی دعوت دینے والے کی بات نہ مانیں وہ زمین پر اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے اور اللہ کے علاوہ ان کے کوئی مددگار نہیں ہیں۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

یہ قصہ اس بات پر واضح دلالت کرتا ہے کہ جنات بھی انسانوں کی مانند مستقل وجود' شعور اور ارادہ رکھتے ہیں اور مکلف ہیں۔ قرآن شریف میں قیامت سے متعلق آیات میں اور بھی آیات ہیں جن کی اس دعویٰ پر دلالت مندرجہ بالا آیت کی دلالت سے کمتر نہیں ہے۔

☆ ضمیر کی آواز

گزشتہ توجیہ کی رو سے نبوت و رسالت سے مراد ضمیر کی آواز پر انسانی معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔ لیکن جو بات قرآن مجید سے سمجھ میں آتی ہے وہ اس کے خلاف ہے:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَ تَقْوٰهَا (شمس : ۸)

ترجمہ : قسم ہے نفس کی اور جس نے اسے موزوں کیا پھر اسے بدکاری اور پرہیزگاری کا الہام کیا۔

اس آیت مبارکہ کی رو سے ہر انسان اپنی خدا داد فطرت کی اساس پر اپنے اعمال کے اچھا یا برا ہونے کو سمجھتا ہے اور یہ کہ اصلاحات کی آواز ہر انسان کے وجود کی گہرائی میں پوشیدہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض لوگ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے کامیاب ہوجاتے ہیں جبکہ بعض اسے نظر انداز کرکے بدبختی کی راہ پر چل پڑتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (شمس : ۱۰)

ترجمہ : یقیناً" فلاح پاگیا جس نے اپنے نفس کی نشوونما کی اور یقیناً" زیانکار ہوا جس نے اسے نشوونما پانے سے روکا۔

اگر نبوت و رسالت ضمیر کی اس آواز کا اثر ہوتی تو سب لوگ نبوت و رسالت کے حامل ہوتے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس منصب کو بعض افراد سے مخصوص کیا ہے، چنانچہ اس کا فرمان ہے:

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام : ۱۲۴)

ترجمہ : جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمیں بھی وہ نہ دیدیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کفار اپنے ایمان لانے کے لئے یہ شرط رکھتے تھے کہ رسالت عام ہو جائے اور انہیں بھی اس میں سے حصہ دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی شرط کو رد کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ رسالت ایک مخصوص عہدہ ہے۔

دوسری توجیہ کے بارے میں

جیسا کہ پہلی توجیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا، فی الحال ہم

دعوت اسلام کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صداقت کو ثابت کرنے کے درپے نہیں ہیں بلکہ فی الحال ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دوسری توجیہ بھی قرآنی بیانات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اس لئے کہ:

دوسری توجیہ کے مطابق جو عقائد انبیاء نے لوگوں کو بتلائے وہ بے بنیاد خرافی عقائد تھے جنہیں علم و تہذیب سے عاری لوگوں پر ایک دینی سیاست کے تحت مسلط کردیا گیا تھا۔ البتہ ان کا مقصد لوگوں کی خیر خواہی تھا تاکہ لوگ اس خدا کے خوف سے جو دینی احکام سے سرتابی کرنے والوں کو سخت سزا دیتا ہے اور قیامت کے دن کے خوف سے کہ جس دن سزا دی جائے گی اور جنت کے لالچ میں کہ جس کی، اطاعت کرنے والوں کو خوشخبری دی گئی اور جو قیامت کے دن ملے گی، دینی قوانین کی اطاعت کریں۔

دوسرے انبیاء کی زندگی کی تاریخ زیادہ واضح نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی تاریخ بہت واضح ہے۔ جو بھی آنحضرت کی حیات اور سیرت طیبہ کا بغور مطالعہ کرے اسے اس بات میں ذرا بھی شک و شبہ باقی نہیں رہے گا کہ آنحضرت کو اپنی دعوت پر سو فی صد ایمان اور مکمل اعتماد اور اطمینان تھا۔ بنا برایں اگر دینی عقائد بے بنیاد خرافات ہوتے تو اسلامی عقائد کے بارے میں قرآن مجید کے دلائل، وجود خدا، اس کی یگانگی اور دوسری صفات اور نبوت و معاد سے متعلق عقائد کے اثبات کے لئے دلائل قائم کرنا ایک بے معنی سی بات ہوتی۔

وحی اور نبوت کے بارے میں خود قرآن کیا کہتا ہے؟

جو کچھ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک آسمانی کتاب ہے جو وحی کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ وحی ایک غیر مادی کلام ہے جسے حواس اور عقلی تفکر کے ذریعے

درک نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کا ادراک ایک خاص قسم کے شعور سے ہی ممکن ہے جو بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق بعض افراد میں پیدا ہوجاتا ہے اور غیبی احکامات کو جو کہ عقل و حس کی رسائی سے بالاتر ہوتے ہیں' وحی اور اللہ تعالیٰ کے سکھانے سے دریافت کرتا ہے۔ اسی کام کی عہد داری کو نبوت بھی کہا جاتا ہے۔

اس بات کو واضح کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات کا بیان کرنا ضروری ہے:

۱۔ اس کتاب کے آغاز میں ہم تفصیل سے بیان کرچکے ہیں کہ کائنات میں موجود تمام انواع خواہ جاندار ہوں یا بے جان' اپنے وجود کا ایک مقصد رکھتے ہیں جس کی طرف وہ آغاز ہی سے متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے علا اپنے مقصد کے مطابق ضروری قوتوں اور وسائل سے بھی لیس ہوتے ہیں جن سے ہر نوع کے افراد اپنے مخصوص افعال کو انجام دیتے ہیں جو انہیں اپنے مقصد سے قریب اور آخر کار کامیابی کے ساتھ ہمکنار کردیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (طٰہٰ : ۵۱)

ترجمہ : ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مخصوص خلقت عطا کی پھر اسے (اس کے نفع و نقصان) کی راہ دکھائی۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی (اعلیٰ : ۳)

ترجمہ : وہ جس نے پیدا کیا اور موزوں کیا اور وہ جس نے مقدار مقرر کی پھر ہدایت دی۔

علاوہ برایں یہ بھی بیان فرمایا کہ نوع انسانی بھی عمومی ہدایت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی زندگی کا بھی ایک مقصد ہے جس کی طرف وہ متوجہ ہے اور اس کی مناسبت سے ضروری قوا اور وسائل

سے لیس ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی اس کی سعادت و کمال ہے جبکہ اس کے حصول سے مایوسی بدبختی اور شقاوت ہے۔ وہ فطری راہنمائی کے ذریعے اپنے مقصد کی طرف ہدایت پاتا ہے۔ انسان کی مخصوص ہدایت سے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا" بَصِيْرًا" اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا" وَّاِمَّا كَفُوْرًا" (دھر : ۳)

ترجمہ : ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا جسے ہم آزماتے ہیں پس ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ بتلا دیا ہے، چاہے وہ شکر گزاری کرے یا ناشکری۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (عبس : ۲۵)

ترجمہ : انسان کو نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کی مقدار مقرر کی پھر اس کی راہ آسان کی۔

☆ زندگی کی راہ میں انسان کی امتیازی حیثیت

جاندار موجودات کو بے جان موجودات پر جو امتیاز اور برتری حاصل ہے وہ یہ ہے کہ جانداروں کے اعمال علمی اعمال ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کو ادراک اور شعور سے انجام دیتے ہیں۔ اس امتیاز میں اگرچہ انسان دوسرے تمام جانداروں کے ساتھ شریک ہے تاہم اسے ایک اور امتیاز بھی حاصل ہے جو یہ ہے کہ وہ عقل و خرد کے زیور سے آراستہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر امکان پذیر عمل کو یونہی انجام نہیں دے دیتا بلکہ اس کے نفع و نقصان کا موازنہ کرتا ہے۔ اگر نفع زیادہ ہو تو اسے انجام دیتا ہے جبکہ نقصان کے زیادہ ہونے کی صورت میں اس سے

اجتناب کرتا ہے۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے اس میں اپنی تشخیص کے مطابق عقل کے حکم کی پیروی کرتا ہے۔ اگر عقل کسی مقام پر یہ دیکھے کہ یہاں نفع ہی نفع ہے تو وہ اس فعل کو ضرور انجام دینے کا حکم صادر کرتی ہے۔ جہاں وہ خالص ضرر یا ضرر کے ساتھ کچھ نفع بھی دیکھے تو وہاں اس فعل کے ترک کرنے کا حکم دیتی ہے۔ (البتہ عقل کے حکم اور فیصلے سے ہماری مراد یہ ہے کہ عقل اس فعل کی انجام دہی یا اس کے ترک کرنے کی ضرورت کا ادراک کرے۔ لیکن اس کی انجام دہی پر آمادہ یا ترک کرنے پر مائل کرنا درحقیقت ان جذبات و احساسات کا کام ہے جن کی بنیاد پر عقل "عمل ادراک" کو انجام دیتی ہے اور کسی عمل کے خالص نفع کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔ چونکہ یہ ادراکات اعتباری اور قراردادی ہیں ان کے بارے میں ادراک، فیصلہ اور حکم بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو خوب سمجھ لینا چاہئے)۔

☆ نوع انسانی کے معاشرتی ہونے کے کیا معنی ہیں؟

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان ایک معاشرتی موجود ہے۔ وہ معاشرے میں رہتا ہے اور معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے، اپنی ضروریات برطرف کرنے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا وہ اپنی طبیعت اولیٰ کے تقاضوں کی وجہ سے ایسا کرتا ہے اور ابتدا سے ہی اس بات پر مائل ہے کہ اپنے تمام کاموں کو اجتماعی طور پر دوسروں سے مل کر انجام دے اور ان اجتماعی کاموں سے اپنے معاشرتی وزن کے برابر اپنا حصہ حاصل کرے؟ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کی ذاتی طبیعت کچھ ضروریات اور احتیاجات رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات اور احساسات بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنی تمام تر قوتوں اور وسائل کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس مرحلے پر وہ دوسرے

انسانوں کی ضروریات اور خواہشات سے بے خبر ہوتا ہے۔

انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے ہر چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے زمین کے عناصر و مرکبات سے مدد لیتا ہے۔ درختوں کے پتوں، پھلوں، ٹہنیوں، تنے اور جڑوں اور مختلف قسم کے حیوانات اور ان سے حاصل شدہ فوائد کو اپنی ضروریات برطرف کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ انسان جو ہر چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے، جب اپنے نوع ہم افراد سے رو برو ہوتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ان کے احترام کے پیش نظر خلوص دل سے ان کی طرف دست تعاون دراز کرکے ان کے مفادات کی خاطر اپنے مفادات کے کچھ حصے سے دست بردار ہو جائے؟ ہرگز نہیں! انسان ایک طرف سے یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام ضروریات کو تنہا پورا نہیں کرسکتا۔ وہ دوسرے انسانوں کی مدد سے ہی ان ضروریات کی تکمیل کو ممکن سمجھتا ہے۔ دوسری طرف سے وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ دوسرے انسان بھی اس کی مانند قوتیں اور خواہشات رکھتے ہیں، خود اس کی طرح وہ بھی اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے ہیں اور انہیں نظر انداز نہیں کرتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ خود کو معاشرتی تعاون پر مجبور پاتا ہے۔ وہ اپنی محنت اور کام کی کچھ مقدار دوسروں کو دے دیتا ہے اور اس کے بدلے میں اپنی ضروریات کے مطابق دوسروں کے کام کے نتائج سے مستفید ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک ایسی منڈی میں داخل ہو جاتا ہے جہاں ہر وقت ضروریات زندگی کی خرید و فروخت جاری رہتی ہے۔

مختصر یہ کہ سارے معاشرے کے تمام کام ایک جگہ ڈھیر کردیئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے معاشرتی وزن یعنی اپنی محنت کی قیمت کے مطابق معاشرتی پیداوار سے حصہ پاتا ہے، جس سے وہ اپنی زندگی کی ضروریات کو برطرف کرتا ہے۔

ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان جو کہ اپنی طبیعت اولیٰ کی رو سے اپنے مفادات کا تحفظ چاہتا ہے' اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی اپنے مفادات کے لئے استعمال کرے اور ان کے کام کے نتائج و ثمرات سے بہرہ مند ہو۔ اس کا معاشرتی تعاون پر آمادہ ہونا اس کی مجبوری ہے۔ بچوں کے طرز عمل کا بغور مشاہدہ کرنے سے یہ مسئلہ بخوبی حل ہوجاتا ہے۔ بچہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے تمام مطالبات اور خواہشات کسی چون و چرا کے بغیر عملی جامہ پہن لیں۔ وہ اس مقصد کے لئے رونے دھونے کا حربہ بھی استعمال کرتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے اور معاشرتی زندگی کے قریب ہوتا ہے' بتدریج اپنے بے بنیاد مطالبات کو ترک کرتا جاتا ہے اور بالآخر انہیں فراموش ہی کردیتا ہے۔

اس دعویٰ کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص دوسروں سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہ لامحالہ معاشرتی تعاون کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسروں سے کام لیتا ہے اور ان کی محنت کا پھل بغیر کسی معاوضہ کے ہتھیا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اسی باہمی تعاون پر مبنی معاشرتی نظام کے بارے میں فرماتا ہے :

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (زخرف : ۳۲)

ترجمہ : ہم نے اس دنیوی زندگی میں ان کی معاش کو ان کے درمیان تقسیم کردیا ہے اور ان میں سے بعض کے درجات کو دوسروں پر بلند کردیا تاکہ وہ ایک دوسرے کا تمسخر اڑائیں۔

یہ آیت کریمہ باہمی تعاون پر مبنی معاشرے کی حقیقت کو نمایاں کرتی ہے جس میں ہر شخص کو کسی جہت سے دوسروں پر برتری حاصل ہے۔ لہٰذا

معاشرے کے تمام افراد مختلف درجات پر فائز ہیں اور ہر ایک اپنی مخصوص برتری کی بنیاد پر دوسروں کا تمسخر اڑاتا ہے اور ان کے اعمال کو اپنے فائدے کی طرف پھیر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ معاشرے کے تمام افراد لباس کے تار و پود کی مانند ایک معاشرتی اکائی کی تشکیل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ (ابراھیم : ۳۲)

ترجمہ : بے شک انسان بڑا ظالم ہے۔

اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا (اسریٰ : ۸۹)

ترجمہ : اس لئے کہ وہ ظالم اور جاھل تھا

یہ آیت انسان کی اس جبلت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی بنیاد پر وہ دوسروں کی چار دیواری میں داخل ہو کر ان کے منافع پر دست درازی کرتا ہے۔

☆ اختلافات کا ظہور اور قانون کی ضرورت

اگرچہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ لین دین میں مجبوراً معاشرتی تعاون کو اپنانے پر تیار ہوا ہے اور یوں درحقیقت اس نے اپنی آزادیء عمل کا کچھ حصہ باقی ماندہ کے لئے قربان کردیا، لیکن افراد کی روحی اور جسمانی قوتوں کے واضح اختلاف کی وجہ سے صرف معاشرتی تعاون کسی درد کا علاج نہیں کرسکتا۔ جب مفادات کا ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو یہی معاشرہ جو اختلافات برطرف کرنے اور اصلاح احوال کی خاطر قائم ہوا تھا فساد و اختلاف کا بنیادی سبب بن جاتا ہے۔

اس مقام پر ایسے مشترک قوانین کی ضرورت پورے طور پر محسوس ہوتی ہے جو معاشرے کے تمام افراد کی نظر میں قابل قبول اور محترم ہوں۔ اس لئے کہ لین دین کے ایک چھوٹے سے معاملے میں بھی جب

تک ایسے قوانین موجود نہ ہوں جو خریدنے اور بیچنے والے کی نظر میں یکساں محترم ہوں تو وہ معاملہ انجام نہیں پا سکتا۔ پس ضروری ہے کہ معاشرے میں ایسے قوانین نافذ ہوں جو معاشرے کو پراگندہ ہونے سے اور افراد کے مفادات کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھیں اور نظام خلقت جو کہ عام انواع کو ان کے مقصد اور کمال تک پہنچنے میں ان کی رہنمائی کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو بھی ایسے قوانین کی طرف رہنمائی کرے جو انسانی معاشرے کی سعادت کے ضامن ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ (عبس : ۲۰)

ترجمہ : انسان کو نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کی مقدار مقرر کی پھر اس کی راہ آسان کی۔

انسان، جس کے لئے معاشرتی زندگی مقرر کردی گئی ہے، اس کی زندگی کی راہ آسان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قوانین اور ضوابط اس کی دسترس میں قرار دیئے جائیں۔

☆ قانون کی طرف راہنمائی کے لئے عقل کافی نہیں ہے

انسان کی ہدایت جس ذریعے سے اور جس مقصد کی طرف بھی ہو، نظام خلقت کی ذمہ داری ہے اس لئے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے لئے مقصد سعادت کو معین کیا اور ہدایت عمومی کو، کہ انسان کی ہدایت بھی جس کا حصہ ہے، اپنے لائحہ عمل کا جزو قرار دیا۔

اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ کار تخلیق میں تضاد او خطا بے معنی ہیں۔ اگر کبھی کوئی سبب اپنے ہدف سے باز رہ جائے یا منحرف ہو جائے تو اس میں اس کا اپنا کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ کسی اور سبب یا اسباب کے زیر اثر وہ اپنی تاثیر کھو دیتا ہے۔ اگر اسباب کے درمیان تصادم اور مزاحمت کا عنصر نہ ہو تو کبھی کوئی سبب دو متضاد کام نہ کرتا اور

نہ ہی اس کے کام میں خطا یا انحراف رونما ہو سکتا۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اختلافات برطرف کرنے کے لئے ضروری قانون کی طرف راہنمائی عقل کا کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ عقل ہی تو ہے جو اختلاف کی دعوت دیتی ہے' یہ عقل ہی تو ہے جو انسان کو اس بات پر اکساتی ہے کہ دوسروں سے خدمت لے اور اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے بے قید و شرط اور مکمل آزادی کے ساتھ عمل کرے۔ اگر یہ معاشرتی توازن کو قبول کرتی ہے تو اس کی وجہ وہ مجبوری ہے جو مفادات کے ٹکراؤ کے نتیجے میں رونما ہوتی ہے۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ ایک قوت عاملہ دو متضاد نتائج (ایجاد اختلاف اور ازالہ اختلافات) کی حامل نہیں ہو سکتی۔

معاشرے پر حاکم قوانین کی بکثرت خلاف ورزی جو ہم روزانہ دیکھتے ہیں' جسے گناہ اور جرم بھی سمجھا جاتا ہے' انہیں لوگوں سے سرزد ہوتی ہے جو عقل رکھتے ہیں' ورنہ اسے جرم یا گناہ نہ سمجھا جاتا۔ اگر عقل اختلافات کو زائل کردینے والے قوانین کی طرف رہنمائی کرسکتی اور قانون شکنی کی جبلت سے پاک ہوتی تو ہرگز اس قانون شکنی کی اجازت نہ دیتی بلکہ اس کی ممانعت کرتی۔

عقل کے ہوتے ہوئے ان خلاف قانون کاموں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عقل نے معاشرتی توازن اور معاشرتی انصاف کے ضامن قوانین کو اس لئے قبول کیا ہے کہ وہ ایسا کرنے پر اس لئے مجبور ہے کہ وہ دیکھتی ہے کہ اگر ایسا نہ کرے تو خود اس کے مفادات کی راہ میں بھی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ اگر یہ رکاوٹیں موجود نہ ہوتیں تو وہ کبھی معاشرتی تعاون اور عدالت کا حکم صادر نہ کرتی۔

جو لوگ قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ یا تو ایسے لوگ ہیں جو قانون نافذ کرنے والے اداروں سے زیادہ طاقتور ہونے کی وجہ سے' بے

باکی کے ساتھ قوانین کو پامال کرتے ہیں-یا پھر وہ لوگ ہیں جو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں' چاہے اس کی وجہ فاصلے کی کثرت' مقام کا استحکام یا ان اداروں کی غفلت ہو- یا پھر ان لوگوں نے ایسے عذر تراش رکھے ہوتے ہیں کہ اپنے خلاف قانون افعال کو قانون کے عین مطابق ظاہر کرتے ہیں یا پھر مظلوم اور پسے ہوئے افراد کی بے کسی اور بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں- بہر حال جو بھی وجہ ہو' اصل بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رکاوٹ کوئی نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو کمزور اور بے اثر ہوتی ہے- ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں عقل کا کوئی حکم موجود نہیں ہوتا' وہ مکمل آزادی سے باز نہیں رکھتی اور دوسروں سے خدمت لینے کی جبلت کو کھلی چھٹی دے دیتی ہے-

نتیجہ یہ کہ عقل ایسے معاشرتی قانون کی طرف رہنمائی نہیں کرسکتی جو معاشرتی مفادات کی اس طرح ضمانت دے کہ افراد کے مفادات کی بھی عادلانہ طور پر حفاظت کرسکے-

اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَيَطۡغٰٓى اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى (علق : ۷)

ترجمہ : بے شک انسان جب اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے تو سرکشی پر اتر آتا ہے-

تعاون اور منافع کی حفاظ کرنے والے قانون سے بے نیازی بھی اسی بے نیازی کے زمرے میں آتی ہے-

☆ انسان کی ہدایت کا راستہ صرف وحی ہے

گزشتہ مباحث سے یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ دیگر تمام انواع کی طرح انسان بھی اپنی زندگی میں ایک سعادت مندانہ ہدف رکھتا ہے- چونکہ اس کی ساخت اور اس کی طبیعی ضروریات کی تکمیل کا تقاضا ہے کہ وہ معاشرتی زندگی اختیار کرے لہٰذا اس کی سعادت اور بدبختی معاشرے کی

سعادت اور بدبختی سے وابستہ ہیں۔ وہ مجبور ہے کہ کسی معاشرے میں رہے اور اپنی ذاتی سعادت اور حسن عاقبت کو معاشرے کی سعادت میں تلاش کرے۔ یہ بات بھی معلوم ہوچکی ہے کہ ایک مشترک قانون ہی میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ براہ راست کسی معاشرے کی اور بالواسطہ فرد کی سعادت کی ضمانت دے۔

یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ دوسری تمام انواع کی مانند ضروری ہے کہ سعادت اور اس کے لوازم کی طرف انسان کی ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ چونکہ انسان کی سعادت' معاشرتی سعادت سے وابستہ ہے لہٰذا ایک مشترک قانون کی طرف ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ علاوہ براین یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ انسانی عقل ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کہ وہ تمام حالات میں معاشرتی عدالت اور عمومی تعاون کا حکم نہیں دیتی۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں عقلی ادراک کے علاوہ ادراک کی ایک اور قسم بھی ہونی چاہئے جس کے ذریعے وہ مذکورہ ہدایت کو حاصل کرسکے۔ ادراک کی یہ دوسری قسم جو نوع انسانی میں پائی جاتی ہے وہی ہے جسے انبیائے الٰہی نے وحی کا نام دیا ہے اور اپنے دعویٰ کے حق میں دلائل پیش کئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

(بقرہ : ۲۱۲)

ترجمہ : لوگ ایک امت تھے۔ یعنی سادگی کے ساتھ اختلافات کے بغیر رہ رہے تھے۔ بعد میں ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء کو مبعوث کیا اور ان کے ساتھ برحق کتاب۔۔ شریعت۔۔ نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کا

فیصلہ کرے۔

مزید فرمایا :

اِنَّا اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ کَمَا اَوْحَیْنَا اِلٰی نُوْحٍ وَالنَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِہٖ.... رُسُلًا مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

ترجمہ : ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسا کہ نوح اور ان کے بعد انبیا پر وحی کی...... یہ سب بشارت دینے والے اور ڈرانے والے رسول تھے۔ مقصد یہ تھا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے خلاف کوئی حجت نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حجت لوگوں پر تمام ہو جائے۔ (نساء : ۱۶۵)

جیسا کہ واضح ہے، پہلی آیت صرف وحی کے راستے کو لوگوں کے اختلافات کے برطرف کرنے کا ذریعہ قرار دیتی ہے جبکہ دوسری آیت وحی و نبوت کو اتمام حجت کی واحد دلیل قرار دیتی ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ عقل، ہدایت اور اتمام حجت کے لئے کافی نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر اگر انبیاء مبعوث نہ ہوتے اور احکام الٰہی کی تبلیغ نہ ہوتی اور لوگ ظلم و فساد کے مرتکب ہوتے تو صرف اس بنیاد پر کہ ان کے پاس عقل تھی جس سے وہ ظلم و فساد کے قبیح کو سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قابل مواخذہ نہ ہوتے۔

☆ ایک اعتراض اور اس کا جواب

اعتراض :

آپ نے اس بنیاد پر کہ عقل انسان کو قانون شکنی اور قانون کی خلاف ورزی سے نہیں روک سکتی' قانون سازی یا بالفاظ دیگر سعادت نوعی کی طرف انسان کی ہدایت کا فریضہ عقل سے لیکر وحی و نبوت کے سپرد کردیا ہے حالانکہ وحی و نبوت کے قوانین بھی قانون کی خلاف ورزی کو ختم کرنے میں موثر واقع نہیں ہوئے۔ بلکہ دینی اور شرعی قوانین کی طرف لوگوں کا میلان عام قوانین کی نسبت کم تر اور ان کی خلاف ورزی عام قوانین کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

جواب :

راہ دکھانا یا ہدایت کرنا اور لوگوں کا اس ہدایت کے مطابق عمل کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ ہدایت عمومی کے فطری قانون کی رو سے نظام خلقت و تکوین کا فرض یہ ہے کہ کسی ذریعے سے نوع انسانی کو ایسے قانون کی طرف ہدایت کرے جو اس کی سعادت کا ضامن ہو' نہ یہ کہ لوگوں کو عملی طور پر قانون شکنی سے باز رکھتے ہوئے پیروی پر مجبور کرے۔

قانون کی وہ خلاف ورزیاں جو آزادی عمل سے مانع نہیں ہیں' انہیں ہم نے عقل کی نا اہلی کی دلیل سے اس لئے قرار نہیں دیا کہ عقل ان اعمال سے باز نہیں رکھتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان موارد میں عقل کسی قسم کا حکم نہیں رکھتی تھی' اور نہ ہی معاشرتی تعاون اور قانون کی پیروی کی دعوت دیتی تھی۔ اس لئے کہ ان امور کی طرف اس کی دعوت اضطرار اور مجبوری کی حالت میں تھی' جب وہ آزادی عمل کی راہ میں کسی رکاوٹ کو موجود پاتی تھی اور یہ جان لیتی تھی کہ یہاں پر آزادی عمل کا ضرر اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جہاں یہ

مجبوریاں اور رکاوٹیں نہ ہوں وہاں عقل قانون کی پیروی کا حکم نہیں دیتی اور نہ ہی قانون شکنی سے روکتی ہے۔

پس چونکہ عقل ہر مقام پر قانون کی پیروی کا حکم نہیں دیتی لہذا انسان کی ہر آن ہدایت کے لئے کافی نہیں ہے۔ لیکن وحی کا راستہ بغیر کسی استثناء کے، کلی و دائمی طور پر قانون کی پیروی کا حکم دیتا ہے اور قانون سازی کا کام اللہ کے سپرد کردیتا ہے جو اپنے علم اور قدرت سے ہر حال میں انسان پر نظر رکھے ہوئے ہے اور کسی امتیاز کے بغیر اچھے عمل کا اچھا بدلہ اور برے عمل کی سزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف : ۴۰)

ترجمہ : حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

مزید ارشاد فرماتا ہے:

فَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَرَهٗ وَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَرَهٗ

ترجمہ : پس جو ذرہ بھر نیکی انجام دے گا اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ بھر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ (زلزال : ۸)

ایک اور مقام پر فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْد (حج : ۱۷)

ترجمہ : بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کی دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے پر گواہ ہے۔

مزید ارشاد فرماتا ہے:

اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ (بقرہ : ۷۷)

ترجمہ : کیا یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ اسے جانتا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا" (احزاب : ۵۲)

ترجمہ : اور اللہ تعالٰی ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

ان آیات کی رو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آسمانی دین جو وحی کے ذریعے ہم تک آیا ہے، معمولی قوانین کی نسبت زیادہ موثر طور پر قانون کی خلاف ورزی کو روکنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ انسانی قوانین کی خلاف ورزی کو روکنے کا آخری راستہ یہ ہے کہ لوگوں کے اعمال کی نگرانی کے لئے نگران مقرر کردیئے جائیں جو قانون شکنی کرنے ولے افراد کو سزا دیں۔ بالفاظ دیگر یہ قانون صرف اسی صورت میں نافذ ہوسکتا ہے جب قانون طاقت ور ہو اور جرم ظاہر و آشکار ہو۔

لیکن آسمانی دین، انسانی قوانین اور معمولی حکومتوں کی طرح لوگوں کے اعمال پر خصوصی نگران مقرر کرنے کے علاوہ کچھ اور اہم اور موثر اقدامات بھی کرتا ہے جو یہ ہیں:

۱ - فریضہ امر بمعروف و نہی از منکر کے تحت تمام افراد کو ایک دوسرے کے اعمال کا نگران مقرر کرتا ہے۔

۲ - یہ دینی عقیدہ کہ انسان کے اچھے اور برے اعمال کا ریکارڈ محفوظ ہوتا رہتا ہے جو قیامت کے دن پیش کردیا جائے گا۔

۳ - سب سے بڑھ کر یہ کہ کائنات کا رب، انسان اور اس کے تمام اعمال پر محیط اور ہر مقام پر حاضر و ناظر ہے۔ اسی طرح جہاں تک سزا کا تعلق ہے تو انسانی قوانین کی طرح دنیوی سزاؤں کے علاوہ اخروی سزائیں، جن میں کسی قسم کے استثنا، اور امتیاز کی گنجائش نہیں ہے، دینی عقائد کا ایک ضروری جزو ہیں۔

اللہ تعالٰی کا فرمان ہے :

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِمِنْکُمْ (نساء : ۵۹)

ترجمہ : اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور صاحبان امر کی جو تم میں سے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (توبہ : ۷۱)

ترجمہ : مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَاماً کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (انفطار : ۱۲)

ترجمہ : اور بے شک تم پر نگران مقرر ہیں۔ جو محترم اور لکھنے والے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔

وَرَبُّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ (سبا : ۲۱)

ترجمہ : اور تیرا رب ہر چیز پر نگران ہے۔

ایک اور اعتراض

گزشتہ مباحث کی رو سے عقل تمام حالات میں قانون کی پیروی اور قانون کی خلاف ورزی سے اجتناب کا حکم نہیں دیتی۔ مگر یہ بات آئمہ اھل بیت کی ان احادیث کے خلاف ہے کہ اللہ تعالٰی نے اپنے بندوں پر دو حجتیں قرار دی ہیں۔ ایک ظاہری حجت جو کہ انبیاء ہیں اور دوسری باطنی حجت جو کہ عقل ہے۔ حالانکہ گزشتہ مباحث کی رو سے اکثر یا تمام خلاف ورزیوں میں عقل کا سرے سے کوئی حکم ہی نہیں ہوتا جو کہ حجت کا درجہ رکھتا ہو۔

جواب

انسان کی عقل عملی کا ناقابل استثنا کام، حصول منفعت اور اجتناب از

ضرر کی دعوت ہے۔ اگر انسان جو کہ اپنے فائدے پر ہی نظر رکھتا ہے اور دوسروں سے کام لینا جس کی فطرت ہے، اضطرار اور ناچاری کی حالت میں معاشرتی تعاون اور اشتراک مساعی پر آمادہ ہوتا ہے، اور اس اضطرار کا سبب بھی ان لوگوں کی طاقت ہو جن سے انسان کام لینا چاہتا ہے اور ان کے اعمال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، یا اس کی وجہ قانون نافذ کرنے والے اداروں یا افراد کی طاقت ہو، تو ان حالات میں اگر اسباب اضطرار میں سے کوئی سبب موجود نہ ہو تو عقل قانون کی اطاعت اور قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کا حکم نہیں دیتی۔ لیکن اگر اس ضطرار کا سبب (جیسا کہ نظریہ وحی کا تقاضا ہے) اللہ تعالیٰ کا حکم، اعمال و کردار پر اس کی نگرانی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نافرمانی کرنے والوں کی بلا استثنا و امتیاز سزا کا عقیدہ ہو، تو ایسی صورت میں عقل کے لئے ایسے حالات ہی پیش نہیں آئیں گے کہ وہ قانون کی پیروی کو غیر ضروری سمجھ کر اس کی خلاف ورزی کرسکے۔ بلکہ وہ بھی ہمیشہ اسی چیز کا حکم دے گی جس کا وحی حکم دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (رعد : ۳۳)

ترجمہ : آیا وہ جو ہر شخص اور اس کے اعمال کے سر پر کھڑا ہے دوسروں کی مانند ہوسکتا ہے۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (طارق : ۴)

ترجمہ : کوئی شخص بھی بغیر نگران کے نہیں ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَة (مدثر : ۳۸)

ترجمہ : ہر شخص اپنے کاموں کا مرھون ہے (یعنی اپنے کاموں کے پاس رہن رکھا ہوا ہے۔ مترجم)

☆ وحی کا راستہ خطا سے پاک ہے

گزشتہ مباحث سے یہ بات روشن ہوچکی ہے کہ وحی کا راستہ اور اس راستے کے ذریعے انسان کو معاشرتی زندگی کے لائحہ عمل کی تعلیم دینا نظام خلقت کا ایک حصہ ہے۔ یہ بات بھی واضح ہوچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی کام میں خطا کا امکان نہیں ہے۔ لہٰذا دین آسمانی جو کہ وحی کے ذریعے لوگوں کو سکھایا جاتا ہے اس تمام مسافت میں کسی بھی قسم کی غلطی اور خطا سے دوچار نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (جن : ۲۸)

ترجمہ کا خلاصہ : صرف وہی غیب کا جاننے والا ہے پس کسی کو اپنے غیب پر مسلط نہیں کرتا سوائے اس کے جسے وہ اپنے رسولوں میں سے پسند کرے۔ اور اس صورت میں آگے اور پیچھے سے ان پر نظر رکھتا ہے تاکہ وہ یقینی طور پر اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیں۔ اس حال میں کہ وہ (اللہ تعالیٰ) اس پر کہ جو کچھ ان کے پاس ہے محیط ہے اور اس نے ہر چیز کو عدداً" گن رکھا ہے۔

یہاں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور رسل کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عالم بالا سے وحی کی تعلیمات کو حاصل کرنے، ان کی حفاظت اور تبلیغ میں کسی قسم کی خطا کے مرتکب نہیں ہوتے اس لئے کہ یہ کارخانہ خلقت میں ہدایت عمومی کے وسائل ہیں۔ اگر یہ وحی کو دریافت کرنے، اس کی حفاظت یا پہنچانے میں خطا کے مرتکب ہوں، یا شیطانی اور نفسانی وساوس کے سبب خیانت کریں، یا معصیت کریں، جو کہ ان کی تبلیغ قولی کے برعکس تبلیغ فعلی ہے، ان تمام

صورتوں میں یہ لازم آئے گا کہ تخلیق کائنات کے ضمن میں ہدایت عمومی کے نظام میں غلطی ہوگئی ہے اور ایک فعل محال وقوع پذیر ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ (نحل : ۹)

خلاصہ ترجمہ : درمیانی اور معتدل راہ کو لوگوں کی دسترس میں دینا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے اور ایک ایسا راستہ بھی ہے جو حق سے منحرف ہے۔

☆ وحی کی حقیقت ہم پر مجہول ہے

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ انسان کی زندگی کا لائحہ عمل جو دراصل اس کی سعادت نوعی کا مقدمہ ہے، اور جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، اس کا حصول عقل کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ بلکہ تعقل اور تفکر کی علاوہ اس کے لئے ادراک کا کوئی اور راستہ ہونا چاہئے تاکہ انسان بحیثیت نوع اپنے فرائض حیات کا علم حاصل کرے۔ یہ راستہ وحی کا راستہ ہے۔

البتہ دلیل کا تقاضا صرف یہی ہے کہ نوع انسانی میں ایسا ادراک موجود ہونا چاہئے نہ یہ کہ یہ ادراک عام ہو۔ بلکہ چونکہ وحی کی دریافت کے لئے ہر قسم کی آلودگی اور پلیدی سے پاک روح کا ہونا ضروری ہے اور دوسری طرف سے نوع انسان کے افراد استقامتِ حال، اعتدالِ ادراک اور باطنی پاکیزگی اور ان کے خلاف صفات میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا چاہئے کہ یہ عطیہ شاذ و نادر بعض افراد کو عطا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں بعض افراد کا پیغمبران الٰہی کی حیثیت سے ذکر موجود ہے۔ لیکن ان کی تعداد اور ان سب کے نام بیان نہیں کئے گئے بلکہ ان میں سے صرف بیس اور کچھ کے اسماء کا ذکر کیا گیا ہے۔(۵)

ہم اس عنایت الٰہی سے محروم ہیں۔ بعبارت دیگر ہم نے اس کا ذائقہ نہیں چکھا اور اس کی حقیقت ہم پر مجہول ہے بلکہ ہم نے فقط اس کے کچھ آثار و نتائج کو دیکھا ہے جن میں ایک قرآن مجید ہے' اور اس کی بعض صفات کو جو نبوت کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں' جانتے ہیں۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے یہی صفات ہیں۔ ممکن ہے بعض دیگر صفات' خواص اور شعبے بھی ہوں جو ہمارے لئے بیان نہیں کئے گئے۔

☆ وحی قرآن کی کیفیت

اجمالی طور پر یہ کہا جاچکا ہے کہ قرآن مجید نے اپنی وحی کے بارے میں جو وضاحت دی ہے اس کی رو سے اس آسمانی کتاب کی وحی تکلیم (کلام کرنے) کی صورت میں تھی۔ .عبارت دیگر اللہ تعالٰی نے اپنے محترم رسول کے ساتھ بات کی جسے آنحضرت نے تمام وجود کے ساتھ (نہ یہ کہ صرف کانوں کے ساتھ) سنا۔

اللہ تعالٰی کا فرمان ہے :

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ : ۵۲)

ترجمہ : کسی شخص کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالٰی اس سے بات کرے مگر یہ کہ وحی کرے۔ یعنی ایسے مخفی اور با اشارہ انداز میں بات کرے جسے کوئی اور نہ سمجھ سکے۔ یا کسی پردے کی اوٹ سے بات کرے یا کوئی رسول بھیجے جو اللہ تعالٰی کے حکم سے اس کی مشیت کے مطابق وحی کرے' اس لئے کہ اللہ تعالٰی بلند مرتبہ اور حکیم ہے۔ اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک روح' قرآن شریف کو آپ کی طرف وحی کیا۔ آپ

اپنے طور پر یہ نہیں جان سکتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اسے ایک نور قرار دیا جس کے ذریعے ہم جسے چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک آپ صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں :

۱ - وہ کلام جس میں اللہ تعالیٰ اور بشر کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہو۔

۲ - وہ کلام جو کسی حجاب کی اوٹ سے سنا جائے جس کی مثال شجرۂ طور ہے جس کے ذریعے حضرت موسیٰ کلام الٰہی کو سنتے تھے۔

۳ - وہ کلام جسے کوئی فرشتہ انسان تک پہنچائے۔ اس صورت میں وحی لانے والے فرشتے کی بات سنی جاتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بیان کر رہا ہوتا ہے۔

دوسری آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن شریف بھی اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہاں سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ وحی قرآن تکلیم اور گفتگو کے ذریعے تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (شعرا : ۱۹۴)

ترجمہ : قرآن شریف کو روح الامین (جبریل) نے آپ کے قلب (نفس) پر آشکار عربی زبان میں نازل کیا تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (بقرہ : ۹۷)

ترجمہ : جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے۔ تو بے شک اسی (جبرئیل) نے اسے آپ کے قلب پر نازل کیا۔

ان دو آیات سے واضح ہوتا ہے کہ سارا قرآن شریف یا اس کا کچھ حصہ فرشتہ وحی جس کا نام جبرئیل اور روح الامین ہے' کے ذریعے نازل ہوا۔ جو کہ تکلیم کی تیسری قسم ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن شریف کو صرف کان سے نہیں بلکہ پورے وجود(٦) کے ساتھ فرشتہ وحی سے دریافت فرمایا تو یہ اس آیہ شریفہ سے مستفاد ہے:

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (نجم : ١٢)

ترجمہ : پس اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کی۔ اس (بندے) کے قلب (نفس) نے جو کچھ دیکھا اس میں کوئی غلطی نہ کی۔ آیا تم اس چیز پر اس سے تکرار کرتے ہو جو اس نے عیاناً" دیکھی ہے۔

ایک اور مقام پر وحی کی دریافت کو الواح کی قرات سے تعبیر فرمایا ہے :

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (بیّنہ : ٢)

ترجمہ : اللہ تعالٰی کی طرف سے ایک رسول جو پاکیزہ صحف کی تلاوت کرتا ہے۔

اس بحث کے اختتام پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ قرآن شریف سے وحی کی اقسام' صفات اور خواص کے ذیل میں اور بھی توضیحات اور مسائل قابل استفادہ ہیں۔ لیکن جو اختصار اس کتاب میں پیش نظر ہے اس کے باعث انہیں یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

حواشی

۱۔ تحدی۔ چیلنج اور مقابلے کی دعوت۔ آیاتِ تحدی وہ آیات ہیں جن میں منکرین وحی کو قرآن جیسا کلام پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ (مترجم)

۲۔ سورہ یونس : ۳۸ ھود : ۱۳

۳۔ سورہ اسری : ۸۸

۴۔ درالمنثور ج ا ص ۹۰ اور نورالثقلین ج ا ص ۸۷ - ۸۹ وغیرہ۔

۵۔ آدم۔ نوح۔ ادریس۔ ہود۔ صالح۔ ابراہیم۔ لوط۔ اسماعیل۔ الیسع۔ ذوالکفل۔ الیاس۔ یونس۔ اسحاق۔ یعقوب۔ یوسف۔ شعیب۔ موسیٰ۔ ہارون۔ داؤد۔ سلیمان۔ ایوب۔ زکریا۔ یحییٰ۔ اسماعیل۔ عیسیٰ۔ محمد۔

یہ وہ پیغمبر ہیں جن کا ان کے نام کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض کا اشارۃً ذکر کیا گیا ہے مثلاً" اسباط جو کہ سورہ نساء میں مذکور ہے یا وہ نبی جن کے اشارے پہ طالوت بنی اسرائیل کے بادشاہ بنے۔ یہ واقعہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۶ میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۸ میں بھی ایک نبی کا ذکر ہے اور سورہ یٰس کی آیت ۱۴ میں بھی کچھ انبیاء کا ذکر ہے۔

۶۔ اس لئے کہ مندرجہ بالا دونوں آیات میں "علی قلبک" کے الفاظ ہیں نہ کہ "علیک" اور قرآن شریف میں قلب سے مراد نفس ہے اس لئے کہ قرآن شریف نے چند مقامات پر درک، شعور اور معصیت کو جو کہ نفس کے کام ہیں قلب کی طرف منسوب کیا ہے۔

چوتھا باب

قرآن شریف کا علوم سے تعلق

الف۔ قرآن شریف میں علم کی عظمت کا بیان اور اس کے حصول کی ترغیب۔

ب۔ وہ علوم جن کی تعلیم کی قرآن شریف دعوت دیتا ہے۔

ج۔ وہ علوم جو قرآن مجید سے مخصوص ہیں۔

د۔ وہ علوم جن کی پیدائش کا سبب قرآن مجید بنا۔

الف۔ قرآن شریف میں علم کی عظمت کا بیان اور اس کے حصول کی ترغیب

علم و دانش کی جو تعریف و ستائش قرآن مجید نے کی کسی اور آسمانی کتاب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس بارے میں یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ قرآن مجید عربوں کے قبل از اسلام کے وحشیانہ دور کو زمانہ جاہلیت کا نام دیتا ہے۔

قرآن شریف نے سینکڑوں آیات میں مختلف طریقوں سے علم و دانش کا ذکر کیا ہے جن میں سے اکثر میں اس کی عظمت اور بزرگی بیان فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان پر اپنے احسانات کے بیان میں فرماتا ہے:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (علق : ۵)

ترجمہ : اس نے انسان کو سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

مزید فرماتا ہے:

یَرْفَعُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ:۱۱)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کو بلند کرتا ہے اور جنہیں علم عطا کیا گیا انہیں بلندی کے کئی درجات دیتا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (زمر : ۹)

ترجمہ : آیا جاننے والے اور نادان مساوی ہوسکتے ہیں۔

رسول اللہ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات میں جو کہ قرآن شریف کے بعد ہدایت کا سرچشمہ ہیں، اس باب میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں۔

وہ علوم جن کی تعلیم کی قرآن شریف دعوت دیتا ہے۔

قرآن مجید نے بہت سی آیات میں (جنہیں کثرت کی وجہ سے ہم نقل نہیں کر رہے) آسمان، چمکتے ہوئے ستاروں، ان کے حالات کے عجیب اختلاف اور ان پر حاکم خلل ناپذیر نظام میں موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ زمین، دریاؤں، پہاڑوں، بیابانوں، زمین کے اندر پوشیدہ عجائب، شب و روز کے اختلاف اور موسموں کی تبدیلی میں غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے۔ نباتات کی حیرت انگیز خلقت اور ان کی زندگی پر حاکم نظام، مختلف حیوانات کی خلقت اور ان کے وجود کی حدود میں جو آثار و احوال رونما ہوتے ہیں، ان میں تفکر اور تعقل کا شوق پیدا کرتا ہے۔ انسان کی اپنی خلقت اور اس میں پنہاں اسرار و رموز، ان سب سے بالا تر نفس اور اس کے باطنی عوالم اور ملکوت اعلیٰ کے ساتھ اس کے روابط، زمین کی سیر اور گزشتہ نسلوں اور معاشروں کے احوال، ان کی تاریخ اور واقعات میں غور و فکر کرنے پر اصرار کرتا ہے۔

اس طرح قرآن شریف طبیعی، ریاضی اور فلسفی علوم اور ادبی فنون،

اور مختصر یہ کہ ان تمام علوم کو حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے جو فکر انسانی کی دسترس میں ہیں اور ان کا جاننا عالم بشریت اور انسانی معاشرے کی سعادت کے لئے مفید ہے۔

بے شک قرآن شریف ان تمام علوم کی طرف دعوت دیتا ہے بشرطیکہ یہ حق و حقیقت کی رہنمائی کریں اور حقیقی جہان بینی کو جس میں خدا شناسی سرفہرست ہے، اپنے دامن میں لئے ہوئے ہوں۔ لیکن جو علوم انسان کی نظر کو اپنے اندر جذب کرلیں، قرآن شریف کی نظر میں جہالت کے مترادف ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ (روم : ۷)

ترجمہ : یہ دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشَاوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ (جاثیہ : ۲۳)

ترجمہ : آیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہ کردیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ پس اللہ کے بعد کون اسے ہدایت دے گا۔

قرآن شریف جو مختلف علوم کو حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے بذات خود معارف الہیہ کا مکمل مجموعہ اور فقہ و اخلاق اسلامی کے کلیات کا حامل ہے۔

ج- وہ علوم جو قرآن مجید سے مخصوص ہیں-

مسلمانوں میں کچھ ایسے علوم بھی موضوع بحث ہیں جن کا موضوع خود قرآن مجید ہے- ان علوم کی تاریخ پیدائش نزول قرآن کے ابتدائی ایام ہیں- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان علوم کے مسائل میں پختگی اور نکھار آتا گیا اور آخر کار ان علوم کے محققین نے ان علوم میں بے شمار کتب لکھیں-

ان میں سے بعض علوم، قرآن کریم کے الفاظ سے متعلق بحث کرتے ہیں جبکہ بعض اس کے معنوی پہلو کو زیر بحث لاتے ہیں-

جو علوم قرآن شریف کے لفظی پہلو سے بحث کرتے ہیں وہ تجوید و قرائت کے علوم ہیں- ان میں سے ایک فن میں حروف تہجی کے تلفظ کی کیفیت اور مرکب اور مفرد حالات میں ان پر طاری ہونے والے عوارض مثلاً" ادغام و تبدیل اور وقف و ابتدا جیسے احکام سے بحث کی جاتی ہے- ایک اور فن سات معروف قرائتوں کے نظم و ضبط اور ان کی توجیہات سے بحث کرتا ہے- تین غیر معروف قرائتوں اور دیگر شاذ قرائتوں سے متعلق بحث بھی اسی فن میں کی جاتی ہے- ایک فن قرآنی سورتوں اور ان کی آیات، کلمات اور حروف کی تعداد اور پورے قرآن کی آیات، کلمات اور حروف کو زیر بحث لاتا ہے- علاوہ ازیں ایک فن قرآن شریف کے مخصوص رسم الخط اور معمول کے عربی رسم الخط سے اس کے اختلاف کے بارے میں بحث کرتا ہے-

جو علوم قرآن شریف کے معانی سے بحث کرتے ہیں ان میں سے ایک فن تنزیل و تاویل، ظاہر و باطن، محکم و متشابہ اور ناسخ و منسوخ جیسے کلیات سے بحث کرتا ہے- ایک فن آیات احکام سے بحث کرتا ہے جو درحقیقت فقہ اسلامی کا ایک شعبہ ہے- ایک فن خاص طور پر قرآنی آیات کے معنی کو زیر بحث لاتا ہے جسے تفسیر قرآن کہا جاتا ہے- تفسیر اور طبقات مفسرین کی بحث اسی کتاب کے دوسرے باب میں بیان ہوچکی ہے-

مسلمان علما اور محققین نے قرآن شریف سے مخصوص ہر علم میں بے شمار کتب لکھی ہیں۔

د۔ وہ علوم جن کی پیدائش کا سبب قرآن مجید بنا

اس بات میں شک و تردید کی کوئی گنجائش نہیں کہ جو دینی علوم آج مسلمانوں میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں ان کے آغاز اور رواج کی تاریخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن شریف جو کہ تمام معارف الہیہ اور قوانین شرعیہ کو ساتھ لیکر آیا ہے، میں محدود ہے۔

چونکہ مقام خلافت نے تالیف اور کتابت حدیث پر پابندی لگا رکھی تھی لہٰذا پہلی صدی ہجری میں یہ علوم غیر منظم طور پر صحابہ اور تابعین میں رائج تھے۔ بہت قلیل تعداد میں لوگوں نے فقہ، تفسیر اور حدیث میں مختصر تالیفات انجام دیں۔ لیکن اکثریت صرف سینہ بسینہ حفظ کے ذریعے یہ علوم حاصل کرتی تھی۔

دوسری صدی کے آغاز میں جب کتابت اور تالیف حدیث پر سے پابندی(۱) اٹھا لی گئی تو ابتدا میں لوگوں نے احادیث کو لکھنے کا آغاز کیا۔ بعد ازاں دیگر علوم سے مربوط تالیف و تصنیف کا کام منظم طور پر شروع ہوا اور اس طرح علم حدیث، علم رجال و درایہ، اصول فقہ، علم فقہ اور علم کلام جیسے علوم وجود میں آئے۔ فلسفہ اگرچہ ابتدا میں یونانی سے عربی میں منتقل ہوکر اسلامی معاشرے میں داخل ہوا اور ایک عرصہ تک اپنی یونانی حالت میں ہی لوگوں کے پاس رہا لیکن آہستہ آہستہ اس پر اسلامی معاشرے کا طرز تفکر غالب آتا گیا اور اس میں مادی اور معنوی تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو فلسفہ آج مسلمانوں میں پایا جاتا ہے، اس میں معارف الہیہ میں کوئی ایسا مسئلہ نظر نہیں آتا جس کا متن اور اس کے دلائل قرآن و حدیث میں نہ پائے جاتے ہوں۲۔

یہی بات علوم ادبیات عربی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کیونکہ علم صرف، نحو، معانی، بیان، بدائع، لغت، فقہ لغت اور اشتقاق جیسے علوم اگرچہ مطلقاً" عربی کلام سے متعلق ہیں، لیکن ان کے بارے میں بھی بلا خوفِ تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس چیز نے لوگوں کو ان علوم میں تحقیق اور ان کے اصول و معانی وضع کرنے پر مائل کیا وہ اللہ تعالٰی کا یہی شاہکار (قرآن مجید) ہے جس نے انہیں اپنے شیریں انداز بیان اور حسن اسلوب کا گرویدہ بنا دیا تھا اور وہ اس کے کلمات کی ساخت، جملوں کی ترکیب، الفاظ کے معانی، بیانات کی فصاحت و بلاغت اور لطیف لفظی صنعتوں سے آشنائی حاصل کرنے کی خاطر مجبور ہوگئے کہ لغت عرب میں موجود ان کے نظائر کو حاصل کرکے ان کی مدد سے تحقیق و جستجو کریں۔ اس طرح صرف، نحو، لغت، معانی، بیان اور بلاغت کے علوم منظم طور پر ابھر کر سامنے آئے۔

منقول ہے کہ ابن عباس جو کہ مفسر صحابہ میں سے تھے اشعار عرب کی روشنی میں آیات کے معانی بیان کرتے تھے اور لوگوں کو عربی اشعار جمع اور حفظ کرنے کی تلقین کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "الشعر دیوان العرب" یعنی شعر دیوان عرب ہیں۔

عربی اشعار و نثر کی طرف اس توجہ کے نتیجے میں یہاں تک پیشرفت حاصل ہوگئی کہ معروف شیعہ دانشمند خلیل بن احمد بصری نے لغت میں "کتاب العین" لکھی اور اشعار کے اوزان کی شناخت کے لئے علم عروض وضع کیا۔ اس کے علاوہ دیگر افراد نے بھی ان دو علوم میں کتب لکھیں۔ اسلام میں فن تاریخ بھی فن حدیث سے ہی وجود میں آیا۔ اس کی ابتدا انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات و حالات اور سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی۔ بعد میں صدر اسلام کی تاریخ بھی اس میں شامل ہوگئی۔ آگے چل کر اس نے تاریخ عالم کی صورت اختیار کرلی اور

طبری، مسعودی، یعقوبی اور واقدی جیسے مورخین نے تاریخ کی کتب لکھیں۔

اسی طرح یہ بات بھی بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر شروع میں طبیعات اور ریاضیات جیسے علوم عقلیہ صرف نقل و ترجمہ کی حد تک مسلمانوں میں رائج ہوئے، مگر بعد میں انہوں نے مستقل طور پر اس میں تحقیق اور نو آوری کا کام انجام دیا۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ بھی وہی ثقافتی جذبہ تھا جو قرآن شریف نے مسلمانوں میں پیدا کیا تھا۔

شروع میں مقام خلافت کے ذریعے جو کہ ان دنوں ملت عرب کے درمیان تھا، یونانی، سریانی اور ہندی زبانوں سے مختلف علوم عقلیہ کا عربی میں ترجمہ ہوا جو بعد میں تمام مسلمانوں کی دسترس میں آگئے جو کہ مختلف قوموں سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے روز بروز اپنے حسن انتظام اور ذوق تحقیق کی بدولت ان علوم کی وسعت اور گہرائی میں اضافہ کیا۔

یہ بات بھی معلوم ہے کہ اسلامی تمدن جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت اور رحلت کے بعد ایک وسیع خطے پر حاکم ہوگیا اور عصر حاضر میں کرہ ارض کے تقریباً ٦٠ کروڑ(٣) افراد اسلام کے حلقہ بگوش ہیں، یہ بھی قرآن مجید کی ایک نمایاں ترین تاثیر ہے۔ (اگرچہ ہم شیعہ اس تمدن کو چلانے والے خلفا اور بادشاہوں کو دینی حقائق کے اجاگر کرنے اور قوانین اسلامی کے صحیح نفاذ میں کوتاہی پر مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا نور جس قدر بھی اس دنیا میں پھیلا اس کا سرچشمہ قرآن شریف ہی ہے) ظاہر سی بات ہے کہ ایسی عظیم تبدیلی عالم بشریت میں بعد میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر کافی حد تک اثر انداز ہوئی۔ لہٰذا قرآن مجید کو دنیا کے موجودہ تغیرات اور ثقافتی پیشرفت کے اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا جاسکتا ہے۔

البتہ اس مسئلہ کی مزید وضاحت اور اس کی اہمیت کو آشکار کرنے کے لئے مزید تجزیہ و تحلیل کی ضرورت ہے لیکن اس کتاب میں مدنظر اختصار

اس کی اجازت نہیں دیتا۔

حواشی

۱۔ یہ پابندی (جیسا کہ تاریخ میں ثابت ہے) عمر بن عبدالعزیز اموی (۹۹ - ۱۰)
نے ختم کی۔

۲۔ الہیات میں بعض فلسفی بحوث کو بعض علما اب تک کفر آمیز قرار دیتے ہیں
(مترجم)

۳۔ چونکہ کتاب کی تالیف آج سے تقریباً" پچیس برس پہلے عمل میں آئی اس
لئے مسلمانوں کی آبادی کو ۶۰ کروڑ لکھا گیا ہے (مترجم)

پانچواں باب

قرآن شریف کی ترتیب نزول اور اس کی اشاعت

- ☆ قرآن مجید کی آیات کس ترتیب سے نازل ہوئیں؟
- ☆ گزشتہ بحث کا استمرار
- ☆ اسباب نزول
- ☆ ان اسباب نزول کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟
- ☆ سورتوں کی ترتیب
- ☆ اس روایت اور دیگر روایات پر ایک نظر
- ☆ تدوین قرآن
- ☆ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد
- ☆ قرآن شریف کے معاملہ میں مسلمانوں کا اہتمام
- ☆ قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے
- ☆ قرائت قران : حفظ و روایت
- ☆ قراء کے طبقات
- ☆ قراء سبعہ
- ☆ آیات قرآن کی تعداد
- ☆ قرآنی سورتوں کے نام
- ☆ قرآن شریف کے اعراب اور رسم الخط

☆ قرآن مجید کی آیات کس ترتیب سے نازل ہوئیں؟

قرآن مجید کی سورتیں اور آیات ایک ساتھ نازل نہیں ہوئیں۔ اگرچہ تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت رسالت کے ۲۳ سالوں پر مشتمل مدت میں بتدریج نازل ہوا۔ لیکن تاریخ کے علاوہ قرآنی آیات بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا"

(اسریٰ: ۱۰۶)

ترجمہ : اور ہم نے قرآن۔ اس کی سورتوں اور آیات۔ کو ایک دوسرے سے جدا کیا تاکہ آپ رک رک کر اسے لوگوں کے لئے پڑھیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا۔

قرآن مجید میں ناسخ اور منسوخ آیات ہیں۔ قرآن مجید میں ایسی آیات بھی ہیں جو ایسے واقعات اور حوادث سے تعلق رکھتی ہیں جو ہرگز ایک دور میں جمع نہیں ہوسکتے۔ لہذا ان کا ایک ساتھ نازل ہونا اور ان واقعات پر گفتگو کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن شریف کی سورتوں اور آیات کے نزول کی ترتیب بھی اس طرح نہیں ہے جیسے موجودہ مصحف میں ہے، کہ پہلے سورۂ حمد نازل ہوئی ہو اس کے بعد سورہ بقرہ، اس کے بعد سورہ آل عمران، نسا اور مائدہ.... ہوں۔ اس لئے کہ اس لحاظ سے بھی قطعی تاریخی دلائل کے علاوہ خود قرآنی آیات بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بعض قرآنی سورتیں اور آیات جو ایسے مضامین کے ساتھ نازل ہوئی ہیں جو ابتدائے بعثت سے مناسبت رکھتے ہیں مثلاً" سورۂ علق اور سورہ نون، قرآن مجید کے آخر میں رکھی گئی ہیں۔ اسی طرح بہت سی سورتیں اور آیات جن کے مضامین زمانہ ہجرت کے مابعد اور عہد رسالت کے آخری دور سے مناسبت

رکھتے ہیں مثلاً" سورۂ بقرہ' آل عمران' نساء' انفال اور توبہ' ابتدائے قرآن میں رکھی گئی ہیں۔ ان مختلف مضامین کی رو سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآنی سورتوں اور آیات کا زمان نزول کے حوادث' واقعات اور ضروریات کے ساتھ مکمل تعلق ہے' جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں رونما ہوئے۔ مثال کے طور پر وہ سورتیں اور آیات جو صرف مشرکوں کو توحید کی طرف بلاتی ہیں اور شرک کی مذمت اور مخالفت کرتی ہیں' ہجرت سے قبل کے مکی دور سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ قتال اور احکام کی آیات ان حوادث اور ضروریات کی مناسبت سے نازل ہوئیں جو ہجرت کے بعد یثرب (مدینہ) میں اسلامی معاشرہ قائم ہونے کے بعد معرض وجود میں آئیں۔

☆ گزشتہ بحث کا استمرار

مذکورہ بیانات کی روشنی میں سورتوں اور آیات کے نزول میں زمان' مکان اور حالات کے اختلاف کی وجہ سے سورتوں اور آیات کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱ - بعض سورتیں مکی ہیں جبکہ بعض مدنی ہیں۔ عام طور پر ہجرت سے قبل جو آیات اور سورتیں نازل ہوئیں انہیں مکی شمار کیا جاتا ہے جب کہ ہجرت کے بعد نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو چاہے مدینہ میں نازل ہوئی ہوں یا مکہ میں' مدنی کہا جاتا ہے۔ اکثر قرآنی سورتیں خصوصاً" چھوٹی سورتیں مکی ہیں۔

۲ - بعض قرآنی آیات سفر میں نازل ہوئیں جبکہ بعض حضر میں۔ اسی طرح بعض آیات دن کو نازل ہوئیں اور بعض رات کے وقت۔ بعض جنگ کی حالت میں اور بعض زمان صلح میں' بعض زمین پر نازل ہوئیں اور بعض آسمان پر اور بعض خلوت میں نازل ہوئیں اور بعض لوگوں کے درمیان۔ ان تقسیمات کو جاننے کے فوائد کو ہم اسباب نزول کی بحث میں

زیر بحث لائیں گے۔

۳ - بعض سورتیں دو مرتبہ نازل ہوئیں۔ جیسا سورہ حمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک مرتبہ مکہ میں نازل ہوئی اور ایک مرتبہ مدینہ میں۔ اسی طرح بعض آیات مکرر نازل ہوئیں مثلاً" فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ سورۂ رحمن میں تیس مرتبہ مکرر ہوئی ہے۔ اسی طرح اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ آٹھ مرتبہ سورہ شعرا میں دہرائی گئی۔ بعض اوقات ایک آیت مختلف سورتوں میں دہرائی گئی مثلاً" وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ چھ مختلف سورتوں میں دہرائی گئی ہے۔ اسی طرح بعض مقامات پر ایک جملہ پوری آیت ہے جبکہ کسی اور مقام پر آیت کا حصہ ہے مثلاً" اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ سورہ آل عمران کے آغاز میں ایک مکمل آیات ہے جبکہ یہی جملہ آیت الکرسی میں آیت کا حصہ ہے۔ البتہ اکثر سورتیں اور آیات ایک مرتبہ نازل ہوئیں اور ایک جگہ سے تجاوز نہیں کرتیں۔ بہرحال قرآنی آیات میں اس قسم کا اختلاف مقام بیان کے تقاضوں کا نتیجہ ہے کہ بعض مقامات پر تکرار ضروری ہوجاتی ہے اور تکیہ کلام کی صورت اختیار کرلیتی ہے جبکہ بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا۔

اسی طرح قرآن شریف کی سورتیں اور آیات طوالت اور اختصار میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً" سورہ کوثر مختصر ترین سورت ہے جبکہ سورۂ بقرہ قرآن شریف کی طویل ترین سورت ہے۔ آیات میں سورۂ رحمٰن کی آیت "مُدْھَآمَّتٰنِ" مختصر ترین قرآنی آیت ہے جو صرف ایک لفظ ہے جبکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ جو کہ قرض سے متعلق ہے قرآن شریف کی طویل ترین آیت ہے اور تیس سے زیادہ جملوں پر مشتمل ہے۔ اس قسم کے تمام اختلافات مقام بیان کے تقاضوں کے مطابق واقع ہوئے ہیں۔ جیسا کہ بعض اوقات دو متصل آیات میں بھی یہ اختلاف موجود ہے۔

مثال کے طور پر سورہ مدثر کی بیسویں اور اکیسویں آیت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں آیات میں پہلی آیت ایک ہی جملہ ہے جبکہ دوسری آیت پندرہ سے زیادہ جملوں پر مشتمل ہے۔ قرآنی سورتوں اور آیات میں ایجاز اور اِطناب(۱) کے لحاظ سے بھی ایسا ہی اختلاف پایا جاتا ہے جو سورہ فجر اور سورۂ لیل کا سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ کے ساتھ موازنہ کرکے دیکھا جاسکتا ہے۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر ایجاز کا اسلوب اپنایا گیا ہے جبکہ مدنی سورتوں میں اطناب کا غلبہ ہے۔

اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی ابتدائی آیات سورۂ علق یا اس کی پہلی پانچ آیات ہیں جبکہ **وَاتَّقُوا يَوْمًا" تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ** (بقرہ :۲۸۱) سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے۔

☆ اسباب نزول

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں اور آیات کا نزول ان حوادث و واقعات سے تعلق رکھتا ہے جو عہد رسالت میں رونما ہوتے رہے۔ مثلاً" سورۂ بقرہ(۲)' سورۂ حشر اور سورۂ عادیات وغیرہ یا پھر اسلامی قوانین اور احکام کی ضرورت کے پیش نظر نازل ہوئیں جیسے سورۂ نساء(۳) سورۂ انفال اور سورۂ طلاق وغیرہ کسی سورت یا آیت کے نزول سے مربوط انہی واقعات اور ضروریات کو اسباب نزول کہا جاتا ہے۔ ان کے جاننے سے انسان کو نزول آیت کے حالات اور مضمون آیت سے ان حالات کے تعلق کو جاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدر اسلام میں صحابہ اور تابعین کی بڑی تعداد نے اسباب نزول کی روایات کو جمع اور محفوظ کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اس بارے میں بے شمار احادیث نقل کیں۔ اہل سنت کے ذرائع سے ان روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے اور

کئی ہزار تک جا پہنچتی ہے جبکہ شیعہ ذرائع سے ان کی تعداد کم ہے اور شائد چند سو سے زیادہ نہ ہو۔ البتہ یہ تمام روایات مسند اور صحیح نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر غیر مسند اور ضعیف ہیں۔

لیکن ان روایات میں زیادہ غور و تحقیق سے انسان ان سے بدگمان ہوجاتا ہے۔ جس کی وجوہات یہ ہیں :

ا۔ ان میں سے اکثر کے سیاق سے یہ بات عیاں ہے کہ راوی نے اس حادثے یا واقع کو جو سبب نزول کی حیثیت رکھتا ہے بالمشافہ معلوم کرکے حفظ نہیں کیا۔ بلکہ وہ ایک واقعہ بیان کرتا ہے پھر ان آیات کو جو معنی کے اعتبار سے اس واقعہ سے مناسبت رکھتی ہیں' واقعہ سے مربوط کردیتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ حدیث میں مذکور سبب نزول' اجتہادی اور نظری ہوتا ہے اور وہ سبب نزول نہیں ہوتا جو مشاہدہ اور حفظ کی راہ حاصل ہو۔

ہمارے اس دعوئ کی دلیل یہ ہے کہ ان روایات میں بہت زیادہ تضاد نظر آتا ہے۔ یعنی بہت سی قرآنی آیات میں سے ہر آیت کے ذیل میں کئی متضاد اسباب نزول بیان کئے گئے ہیں جن کا یکجا جمع ہونا محال ہے یہاں تک کہ بعض اوقات ایک ہی شخص مثلاً" ابن عباس یا کسی اور سے ایک ہی آیت کے کئی اسباب نزول روایت کئے گئے ہیں۔ ان متضاد اور غلط اسباب نزول کی ان دو میں سے ایک توجیہ کی جاسکتی ہے۔ ایک یہ کہ یہ اسباب نزول صرف نقلی نہیں بلکہ نظری ہیں اور متضاد روایات میں سے ہر روایت کے راویوں نے آیت کو کسی مناسب قصے کے ساتھ جوڑا ہے جو دوسری روایت میں مذکور قصے سے مختلف ہے۔ یا یہ کہ ایک ہی شخص جو دو متضاد اسباب نزول نقل کرتا ہے دو آراء میں الجھا ہوا ہے اور ایک رائے سے دوسری رائے کی طرف مائل ہوگیا ہو۔ یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام یا ان میں سے بعض روایات جعلی اور من گھڑت ہیں۔

ان احتمالات کی وجہ سے اسباب نزول کی روایات غیر معتبر ہوجاتی ہیں۔ اس لحاظ سے حدیث کا صحیح السند ہونا بھی سود مند نہیں رہتا اس لئے کہ سند کے صحیح ہونے سے رجال سند کے جھوٹے ہونے کا امکان زائل یا ضعیف ہو جاتا ہے لیکن جعل یا کسی خاص نظریئے کے بیان کا احتمال بہرحال قائم رہتا ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ صدر اسلام میں مقام خلافت کی طرف سے کتابتِ حدیث کی سخت ممانعت تھی اور جہاں بھی کوئی حدیث تحریری صورت میں ملتی اسے ضبط کرکے جلا دیا جاتا تھا۔ یہ پابندی پہلی صدی ہجری کے آخر تک یعنی نوے سال تک برقرار رہی۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا "نقل بہ معنی(۴)" کا راستہ بہت زیادہ کھل گیا اور ہر مرحلہ پر نقل حدیث میں رونما ہونے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں رفتہ رفتہ ایسی صورت اختیار کرگئیں کہ بعض اوقات اصل مطلب ضائع ہو جاتا ہے۔ مختلف ذرائع سے نقل شدہ واقعات یا روایات کی طرف رجوع کیا جائے تو یہ حقیقت مکمل طور پر عیاں ہوجاتی ہے۔ بعض اوقات انسان ایک ہی واقعہ کو بیان کرنے والی مختلف روایات سے بھی روبرو ہوجاتا ہے' جن میں کوئی قدر جامع موجود نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ نقل بہ معنی کی اس کثرت کے بعد اسباب نزول کا کوئی اعتبار یا تو سرے سے باقی نہیں رہتا یا پھر کم ضرور ہوجاتا ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ جعلسازی و دسیسہ کاری' خصوصاً" اسرائیلیات کی بھرتی اور پوشیدہ منافقین کی بنائی ہوئی احادیث کو بھی مدنظر رکھا جائے تو اسباب نزول پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہتا۔

☆ ان اسباب نزول کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟

جیسا کہ گزشتہ فصلوں میں بیان ہوچکا ہے کہ حدیث اپنے معتبر ہونے کے لئے قرآن شریف کی طرف سے تصدیق کی محتاج ہے۔ بنا براین جیسا کہ رسول اللہ اور آئمہ علیہم السلام سے منقول بہت سی احادیث میں بیان

ہوا ہے، حدیث کو قرآن کی روشنی میں جانچنا چاہئے۔ لہٰذا اگر کسی آیت کے ذیل میں بیان شدہ شان نزول متواتر یا یقینی حدیث نہ ہو تو اسے قرآن شریف کی روشنی میں پرکھا جائے۔ اگر آیت کا مضمون اور دیگر قرائن اس شان نزول کے ساتھ ھماھنگی رکھتے ہوں تو اس پر اعتماد کرنا چاہئے ورنہ نہیں۔ بہر صورت روایت کی تصدیق آیت سے کروانی چاہئے نہ یہ کہ آیت کو روایت کے تابع کردیا جائے۔ اس طرح اگرچہ بہت سے اسباب نزول درجہ اعتبار سے ساقط ہو جائیں گے لیکن جو بچ جائیں گے وہ معتبر ہوں گے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم بیان کریں گے، قرآن مجید کی عظیم الشان، آفاقی اور دائمی تعلیمات، اسباب نزول کی روایات کی چنداں محتاج بھی نہیں ہیں۔

☆ سورتوں کی ترتیب نزول

البتہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں' قرآنی سورتیں اور آیات جس ترتیب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئیں اس کے مطابق مصحف میں ثبت نہیں ہیں۔ گزشتہ علمائے اسلام' خصوصاً" اہل سنت' سورتوں اور آیات کی ترتیب کے بارے میں روایات پر اعتماد کرتے تھے۔ ان روایات میں سے ایک ابن عباس سے منقول ہے۔ اس کے مطابق(۵) "مکہ میں جو سورت نازل ہوتی تھی اس کی ابتدا وہیں لکھ دی جاتی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو چاہتا اس میں اضافہ کردیتا۔ سب سے پہلے جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ تھی:

۱ - اقرا باسم ربک	۲ - بعد ازان "ن"
۳ - مزمل	۴ - مدثر
۵ - لہب	۶ - تکویر
۷ - اعلیٰ	۸ - واللیل
۹ - والفجر	۱۰ - والضحیٰ
۱۱ - الم نشرح	۱۲ - والعصر
۱۳ - والعادیات	۱۴ - الکوثر
۱۵ - التکاثر	۱۶ - الماعون
۱۷ - الکافرون	۱۸ - الفیل
۱۹ - الفلق	۲۰ - الناس
۲۱ - اخلاص	۲۲ - والنجم
۲۳ - عبس	۲۴ - القدر
۲۵ - والشمس	۲۶ - البروج
۲۷ - والتین	۲۸ - قریش
۲۹ - القارعہ	۳۰ - القیامہ

۳۱ - ہمزہ	۳۲ - المرسلات
۳۳ - ق	۳۴ - البلد
۳۵ - الطارق	۳۶ - قمر
۳۷ - ص	۳۸ - اعراف
۳۹ - جن	۴۰ - یس
۴۱ - فرقان	۴۲ - ملائکہ (فاطر)
۴۳ - کھیعص (مریم)	۴۴ - طہ
۴۵ - واقعہ	۴۶ - شعرا
۴۷ - طس (نمل)	۴۸ - قصص
۴۹ - بنی اسرائیل (اسراء)	۵۰ - یونس
۵۱ - ہود	۵۲ - یوسف
۵۳ - حجر	۵۴ - انعام
۵۵ - صافات	۵۶ - لقمان
۵۷ - سبا	۵۸ - زمر
۵۹ - مومن	۶۰ - حم سجدہ
۶۱ - شوریٰ	۶۲ - زخرف
۶۳ - دخان	۶۴ - جاثیہ
۶۵ - احقاف	۶۶ - ذاریات
۶۷ - غاشیہ	۶۸ - کہف
۶۹ - نحل	۷۰ - نوح
۷۱ - ابراہیم	۷۲ - انبیاء
۷۳ - مومنین	۷۴ - تنزیل سجدہ (سجدہ)
۷۵ - طور	۷۶ - ملک
۷۷ - الحاقہ	۷۸ - معارج

۷۹ - النباء	۸۰ - النازعات
۸۱ - انفطار	۸۲ - اشتقاق
۸۳ - روم	۸۴ - عنکبوت
۸۵ - مطففین	

یہ سب مکی سورتیں ہیں ان کے بعد مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی ترتیب اس طرح ہے:

۸۶ - بقرہ	۸۷ - انفال
۸۸ - آل عمران	۸۹ - احزاب
۹۰ - ممتحنہ	۹۱ - نساء
۹۲ - زلزال	۹۳ - حدید
۹۴ - قتال (محمد)	۹۵ - رعد
۹۶ - رحمٰن	۹۷ - انسان (دہر)
۹۸ - طلاق	۹۹ - بینہ
۱۰۰ - حشر	۱۰۱ - نصر
۱۰۲ - نور	۱۰۳ - حج
۱۰۴ - منافقون	۱۰۵ - مجادلہ
۱۰۶ - حجرات	۱۰۷ - تحریم
۱۰۸ - جمعہ	۱۰۹ - تغابن
۱۱۰ - صف	۱۱۱ - فتح
۱۱۲ - مائدہ	۱۱۳ - برائت (توبہ)

☆ اس روایت اور دوسری روایات پر ایک نظر

مذکورہ روایت میں جو ابن عباس نے منقول ہے ۱۱۳ سورتوں کا ذکر ہو ہے۔ سورہ حمد کا ذکر اس روایت میں نہیں ہے۔

ایک اور روایت جسے بیہقی(۶) نے عکرمہ سے نقل کیا ہے اس میں

ایک سو گیارہ سورتوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس میں سورہ حمد، اعراف اور شوریٰ کا ذکر نہیں ہے۔

اسی روایت کو بیہقی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے اور اس میں تمام کی تمام ۱۱۴ سورتوں کا ذکر ہے۔ لیکن بیہقی کی دونوں روایات میں ایک تو سورہ مطففین کو مدنی سورتوں میں شمار کیا ہے جبکہ گزشتہ روایت کی رو سے یہ سورت مکی ہے۔ اس کے علاوہ ان روایات میں مدنی اور مکی سورتوں کی ترتیب بھی گزشتہ روایت سے مختلف ہے۔

ایک اور روایت(۷) علی بن ابی طلحہ سے منقول ہے۔ اس روایت میں ہے کہ:

مدینہ میں سورہ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انفال، توبہ، حج، نور، احزاب، والذین کفروا، فتح، حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، تغابن، طلاق، تحریم، فجر، لیل، قدر، بینہ، زلزال اور نصر نازل ہوئیں اور باقی تمام سورتیں مکی ہیں۔

بالفاظ دیگر اس روایت میں صرف مکی اور مدنی سورتوں کا بیان ہے، ترتیب کا نہیں، ورنہ مائدہ اور توبہ کا ذکر اس مقام کے بعد ہوتا جہاں ان کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس روایت نے سورہ فجر، لیل اور قدر کو مدنی سورتوں میں شمار کیا ہے، حالانکہ گزشتہ روایات میں انہیں مکی قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح اس روایت کے مطابق رعد، رحمٰن، دہر، جمعہ اور حجرات کو مکی سورتوں میں قرار دیا گیا ہے جبکہ گزشتہ روایات میں انہیں مدنی سورتوں میں شمار کیا گیا تھا۔

ایک اور روایت جو قتادہ سے منقول ہے یہ کہتی ہے کہ مدینہ میں بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، برائت، رعد، نحل، حج، نور، احزاب، محمد، فتح، حجرات، رحمٰن، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم آیت نمبر ۱۳ تک، زلزال اور نصر نازل ہوئیں اور باقی قرآن مکہ میں نازل

ہوا۔

یہ روایت بھی گزشتہ روایات، خصوصاً" قتادہ کی اپنی روایت کے ساتھ سورہ مطففین، دھر اور بینہ کے بارے میں اختلاف رکھتی ہے۔

ان روایات کے بارے میں صرف ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے کہ نہ دینی روایت کی قدر و قیمت کی حامل ہیں اور نہ ہی تاریخی نقل کے لحاظ سے ان کی کوئی حیثیت ہے۔ دینی لحاظ سے اس لئے کہ ان کی سند رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نہیں پہنچتی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ابن عباس نے یہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لی ہے یا کسی اور سے، کہ جن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون ہیں، یا پھر یہ کہ یہ ابن عباس کی اجتہادی رائے ہے جو صرف ان کے اپنے لئے حجت ہے۔

تاریخی لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ ابن عباس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا بہت کم عرصہ دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان تمام سورتوں کے نزول کے وقت حاضر نہیں تھے لہٰذا اگر ان کی رائے اجتہادی نہ ہو بلکہ دوسروں سے سنی گئی ہو تو ایک بے سند خبر سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایسی روایت کی تاریخی لحاظ سے کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر، اگر یہ تمام احادیث صحیح بھی ہوں، تو ان کی حیثیت خبر واحد سے زیادہ نہیں ہوگی اور علم اصول میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ احکام شرعیہ کے علاوہ دیگر امور میں ایسی خبر معتبر نہیں ہوتی۔

گزشتہ بحث کی رو سے، سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کی شناخت کا راستہ یہ ہے کہ ان کے مضامین میں تدبر کیا جائے، اور انہیں ہجرت سے قبل اور بعد کے حالات پر منطبق کیا جائے۔ یہ راستہ جہاں تک قابل عمل ہو سورتوں اور آیات کے مکی یا مدنی ہونے کی شناخت میں مفید ہے جیسا

کہ سورۂ دہر، عادیات اور مطففین کے مضامین ان کے مدنی ہونے کی شہادت دیتے ہیں جبکہ ان روایات میں سے بعض نے انہیں مکی قرار دیا ہے۔

☆ تدوین قرآن (زمانہ رسول میں)

قرآن مجید جو سورت سورت اور آیت آیت نازل ہوا اپنی غیر معمولی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے عربوں میں، جوکہ فصاحت و بلاغت کے عاشق و دلدادہ تھے، روز بروز مشہور ہوتا گیا۔ لوگ اس کی چند آیات سننے کے لئے دور دور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے اور کچھ آیات سنتے اور یاد کرلیتے۔

اسی طرح بزرگان مکہ اور رہبران قریش، جو بت پرست اور دعوت اسلام کے سخت مخالف تھے، ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک جانے سے روکتے تھے اور قرآن شریف کو جادو قرار دے کر لوگوں کو ڈراتے اور انہیں اس کے سننے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے۔ اس کے باوجود وہ رات کی تنہائی اور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر، ایک دوسرے سے، اپنے رشتہ داروں اور پیروکاروں سے چوری چھپے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے نزدیک کسی جگہ بیٹھ کر آنحضرت کی تلاوت قرآن کو سنتے(۸)

البتہ مسلمان بھی، قرآن شریف کو کلام خدا اور واحد دینی سند سمجھنے کی وجہ سے، اور اسی وجہ سے بھی کہ فریضہ نماز میں سورۂ حمد اور قرآن شریف کے کسی اور حصے کی تلاوت کے پابند تھے، اور اس وجہ سے بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں قرآن مجید اور احکام اسلام کی تعلیم دینے پر مامور(۱۰) تھے قرآن شریف کی سورتوں اور آیات کو حفظ اور ثبت کرنے میں بہت کوشاں رہتے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں

اسلامی معاشرہ قائم فرمایا تو یہ کام زیادہ منظم ہو کر انجام پانے لگا۔ آنحضرت کے حکم پر صحابہ کی خاصی تعداد قرائت قرآن اور روز بروز نازل ہونے والے احکام اسلام کے تعلیم و تعلم کا فریضہ انجام دینے لگے۔یہاں تک کہ قرآن شریف کے صریح حکم کی رو(۱۱) سے انہیں جہاد میں شرکت سے مستثنیٰ کردیا گیا۔

چونکہ اکثر صحابہ، خصوصاً" وہ جو مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے، ناخواندہ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے یہودی قیدیوں سے پڑھنا لکھنا سیکھنے کے لئے استفادہ کیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک خواندہ جماعت معرض وجود میں آگئی۔ اس جماعت کے وہ افراد جو قرائت قرآن اور سورتوں اور آیات کے حفظ اور ثبت میں مشغول تھے، قراء کہلاتے تھے۔ بئر معونہ کے واقعہ میں جو چالیس یا ستر افراد اکٹھے شہید ہوئے ان کا تعلق اسی جماعت سے تھا(۱۲)

قرآن شریف میں سے جو کچھ نازل ہوتا، جو کہ بتدریج نازل ہوتا تھا، تختیوں، اونٹ کے شانوں کی ہڈی، کھجور کی چھال وغیرہ پر لکھ کر محفوظ کرلیا جاتا تھا۔

اس بات میں شک و شبہ اور انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اکثر قرآنی سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے پہلے مسلمانوں میں معروف اور رائج تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے طریقہ تبلیغ کو بیان کرنے والی بیسیوں اور سینکڑوں احادیث شیعہ اور سنی ذرائع سے منقول ہوئی ہیں، یا پھر اس دور میں پڑھی جانے والی نمازوں اور تلاوت قرآن کو بیان کرتی ہیں، ان میں ان سورتوں کے نام بیان ہوئے ہیں۔

اسی طرح سورتوں کے مختلف گروہوں کے نام مثلاً" طوال، مئین، مثانی اور مفصلات وغیرہ زمانہ رسول کے حالات کو بیان کرنے والی احادیث میں

مذکور ہوئے ہیں۔

☆ رحلت کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت علی علیہ السلام جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قطعی ارشادات کی رو سے سب لوگوں سے بڑھ کر قرآن شریف کے عالم تھے' اپنے گھر میں گوشہ نشین ہوگئے(۱۳) اور قرآن شریف کو ترتیب نزول کے مطابق ایک مصحف کی صورت میں جمع کردیا۔ ابھی رحلت نبوی کو چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس کام کو مکمل کرلیا اور اپنے لکھے ہوئے مصحف کو ایک اونٹ پر لادا اور لاکر لوگوں کو دکھایا(۱۴)۔

رحلت نبوی سے ایک سال(۱۵) سے کچھ زائد عرصہ گزرنے کے بعد جنگ یمامہ وقوع پذیر ہوئی۔ اس جنگ میں ستر قاری شہید ہوگئے۔ مقام خلافت نے اس خوف کے پیش نظر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں آنے والی کسی جنگ میں باقی ماندہ قاری بھی شہید ہو جائیں اور قاریوں کے خاتمہ سے قرآن شریف بھی ناپید ہو جائے' قرآنی آیات اور سورتوں کو ایک مصحف میں جمع کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ خلیفہ کے حکم پر زید بن ثابت کی براہ راست نگرانی میں قراء کی ایک جماعت نے قرآن شریف کو' الواح' کھجور کے پتوں' اور اونٹ کے شانوں کی ہڈیوں پر سے' جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں محفوظ تھیں یا قراء کے پاس تھیں' ایک مصحف کی صورت میں جمع کردیا اور اس کی نقلیں مختلف علاقوں میں بھیج دی گئیں۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد خلیفہ سوم کی زمانے میں (خلیفہ) کو اطلاع ملی کہ قرآن شریف کے نسخے تیار کرنے اور قرائت قرآن میں لوگوں کی لاپرواہی اور کم توجہی کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے قرآن شریف میں تحریف اور تبدیلی کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس خطرے کا

مقابلہ کرنے کے لئے خلیفہ نے حکم دیا کہ خلیفہ اول کے دور میں جمع شدہ مصحف کا ایک نسخہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ حفصہ بنت عمر کے پاس تھا' بطور امانت حاصل کرلیا جائے اور صحابہ میں سے پانچ قاریوں کو جن میں زید بن ثابت بھی تھے' مامور کیا کہ اس کی بہت سی نقلیں تیار کریں جو بعد میں تیار کی جانے والی نقول کی بنیاد قرار پائیں۔ اس کے علاوہ خلیفہ نے حکم دیا کہ مختلف شہروں میں لوگوں کے پاس قرآن شریف کی جو نقول موجود ہیں انہیں جمع کرکے مدینہ بھیج دیا جائے۔ جب یہ نقول مدینہ پہنچتی تھیں تو خلیفہ کے حکم سے جلا دی جاتی تھیں (یا بعض مورخین کے بقول انہیں ابال کر ضائع کردیا جاتا تھا)

بہر حال قرآن شریف کی چند نقول تیار ہوگئیں جن میں سے ایک مدینہ میں رکھی گئی اور باقی نقول میں سے ایک مکہ' ایک شام' ایک کوفہ اور ایک بصرہ بھیج دی گئی۔ اس کے علاوہ ایک ایک نقل یمن اور بحرین بھی بھیجی گئی۔ ان نقول کو مصحف امام کہا جاتا ہے جو دیگر تمام نقول کی اصل اور بنیاد ہیں۔

ترتیب کے لحاظ سے ان نسخوں اور پہلے مصحف میں صرف اتنا فرق(١٦) ہے کہ سورہ توبہ کو پہلے مصحف میں مئین اور سورۂ انفال کو مثانی میں رکھا گیا تھا جبکہ مصحف امام میں سورہ انفال اور برات کو ایک ساتھ سورہ اعراف اور سورہ یونس کے درمیان رکھا گیا۔

☆ قرآن شریف کے معاملہ میں مسلمانوں کا اہتمام

جیسا کہ پہلے ارشاد ہوچکا ہے کہ قرآن شریف کی پہلی اور دوسری تدوین کے زمانے میں قرآنی سورتیں اور آیات عوام کے ہاتھ میں تھیں اور وہ ان کی حفاظت کے لئے حتی الوسع کوشش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ صحابہ اور تابعین میں قراء کی ایک بڑی جماعت ایسی بھی تھی جس کا قرات قرآن کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ قرآن شریف ان کے سامنے جمع

اور مدون ہوا۔ ان سب نے تیار شدہ مصحف کو قبول کیا' اس کی نقول بنائیں اور کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔

تالیف عثمانی (دوسری تالیف) میں آیہ کریمہ : **وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ**(۱۷) کے ابتدا میں موجود "و" کو حذف کرنے کی کوشش کی گئی تو اس دور کے قراء اس سے مانع ہوئے اور ابی بن کعب(۱۸) نے تو قسم کھا کر کہا کہ اگر "و" حذف کردی گئی تو میں ان کے ساتھ مسلح جنگ کروں گا۔ آخر کار "و" کو درج کرنا پڑا۔ خلیفہ(۱۹) دوم نے اپنے دور خلافت میں **السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ**(۲۰) کو پڑھتے وقت **والانصار** کی "و" حذف کردی جس پر قراء نے ان کی مخالفت کی اور انہیں مجبورا" "و" کو پڑھنا پڑا۔

حضرت علی علیہ السلام نے اگرچہ اس سے پہلے ہی ترتیب(۲۱) نزول کے مطابق قرآن شریف کو جمع کرلیا تھا اور لوگوں کو دکھا بھی دیا تھا جسے قبول نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پہلی اور دوسری تدوین میں سے کسی میں بھی حضرت علی علیہ السلام کو شریک نہیں کیا گیا تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے کوئی مخالفت نہیں کی اور رائج مصحف کو قبول کرلیا اور زندگی بھر' حتی کہ اپنے دور خلافت میں بھی مخالفت نہیں کی۔ اسی طرح آئمہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین نے بھی کبھی' حتی کہ اپنے خاص شیعوں سے بھی' قرآن شریف کے اعتبار کے بارے میں کچھ نہیں کہا بلکہ اپنے بیانات میں ہمیشہ قرآن شریف کو سند قرار دیا اور اپنے شیعوں کو بھی حکم دیتے(۲۲) کہ قرائت قرآن میں لوگوں کی پیروی کریں۔

یہ بات بڑی جرائت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا اس سلسلے میں سکوت صرف اسی لئے تھا کہ تفسیر قرآن میں اھل بیت کا ذوق تفسیر قرآن بالقرآن کا ذوق تھا' جس کی رو سے مکی اور مدنی

سورتوں اور آیات کی ترتیب' قرآن شریف کے عالیشان مقاصد پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ ہر آیت کی تفسیر میں تمام آیات کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جو کلام ابدی اور عالمگیر نوعیت کا ہو' زمان و مکان کی خصوصیات اور وقت نزول کے واقعات' جنہیں شان نزول کہا جاتا ہے' اس کے مقاصد کلی اور مطالب پر اثر انداز نہیں ہونے چاہئیں۔

بے شک ان خصوصیات کے جاننے سے بعض فوائد مثلاً" معارف و احکام اور جزئی واقعات جو نزول کے وقت پیش آئے' ان سے آشنائی حاصل ہو جاتی ہے اور ۲۳ سال کی مدت میں دعوت اسلامی کی ترقی اور پیشرف کے بارے میں آگاہی وغیرہ حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن وحدت اسلامی کی حفاظت (جوکہ ہمیشہ آئمہ اہل بیت کے مدنظر تھی) ان چھوٹے چھوٹے مفادات سے بہت اہم تھی۔

☆ قرآن شریف ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے

قرآن شریف کی روز اول سے آج تک کی ساری تاریخ مکمل طور پر واضح ہے۔ قرآنی آیات اور سورتیں ہمیشہ مسلمانوں کی زبان پر تھیں اور ایک سے دوسرے شخص تک منتقل ہوتی رہی ہیں۔ ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ آج جو قرآن شریف ہمارے پاس ہے بالکل وہی ہے جو چودہ سو سال قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ لہذا قرآن شریف کو اپنے معتبر ہونے اور اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے تاریخ کے سہارے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے' اگرچہ اس کی تاریخ بھی روشن اور آشکار ہے۔ اس لئے کہ جو کتاب کلام خدا ہونے کی مدعی ہو اور اپنے متن کو ہی اپنے دعوئ کی دلیل قرار دیتی ہو' جن و انس کو اپنے ساتھ مقابلہ کی دعوت دیتی ہو اور ان کے عاجز ہوجانے کی پیشینگوئی کرتی ہو' اس کے کتاب خدا ہونے' ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہونے اور اپنی اصلی حالت پر باقی ہونے کے لئے اسے اپنے علاوہ کسی اور دلیل اور ثبوت کی

ضرورت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اپنے معتبر ہونے کے اثبات کے لئے اسے کسی شخص کی حمایت اور تصدیق کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

موجودہ قرآن شریف کے اصل قرآن ہونے کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ جو اوصاف اور امتیازات قرآن شریف نے اپنے لئے بیان کئے ہیں آج بھی اپنی اصلی حالت پر قائم اور باقی ہیں۔

قرآن شریف کہتا ہے: "میں نور اور ہدایت ہوں اور حق و حقیقت کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہوں۔ میں دو چیزوں کو بیان کرتا ہوں اور جو کچھ انسان کی زندگی کے لئے ضروری ہے اور انسانی فطرت کے ساتھ ہمآنگ ہے اسے واضح کرتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہوں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ میں کسی غیر اللہ کا کلام ہوں تو جن اور انس جمع ہو کر پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مانند ایک ناخواندہ شخص سے جس نے یتیمی میں کسی مربی و سرپرست کے بغیر، جاملیت کے ماحول میں نشوونما پائی ہو، اس کتاب جیسی کتاب لے آؤ یا اس کتاب کے اسلوب یا معارف و احکام میں کوئی اختلاف دکھا دو جیسا کہ انسانی کلام میں ہوا کرتا ہے"۔

قرآن شریف کے یہ تمام اوصاف اور امتیازات اپنی جگہ پر اب بھی ثابت اور قائم ہیں۔ جہاں تک حق و حقیقت کی طرف رہنمائی کا تعلق ہے، موجودہ قرآن شریف اپنے فصیح و بلیغ بیانات کے ذریعے اور دقیق ترین عقلی دلائل کے ساتھ کائنات شناسی کی ایک مکمل کتاب ہے اور انسان کی سعادتمندانہ زندگی کا سب سے بڑا ستون ہے جو مکمل خیر اندیشی سے انجام کار پر نظر رکھتے ہوئے لوگوں کو اس سعادتمندانہ زندگی کی طرف بلاتا ہے۔

جہاں تک انسان کی تمام ضروریات کے بیان کا تعلق ہے قرآن مجید اپنی حقیقت پسندی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی یگانگت کو بنیاد قرار دیکر، تمام عقیدتی معارف کو اس سے اخذ کرتا ہے اور اس مرحلہ میں قرآن شریف

نے چھوٹے سے نکتے کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ پھر ان سب سے انسانی اخلاق فاضلہ کو اخذ کر کے ان کی تعمیر کو زیر بحث قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد انسان کے فردی اور معاشرتی اعمال کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انسان کی فطرت اور جبلت کے تقاضوں کے عین مطابق انسانی فرائض کے کلی ضوابط بیان کرتا ہے اور جزئیات کا بیان سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے کردیتا ہے۔ یوں کتاب و سنت سے دین اسلام اپنی حیرت انگیز وسعت کی ساتھ ہمارے ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ ایسا دین ہے جو انسان کی فردی اور معاشرتی زندگی کی تمام باریکیوں اور جہات کو تمام افراد اور ہر دور کے لئے بیان کر کے ان کے بارے میں مثبت حکم صادر کرتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کے اجزا اور مواد میں کسی قسم کا اختلاف یانا ہماہنگی پائی جائے۔ یہ ایسا دین ہے کہ دنیا کے ماہر ترین قانون دان بھی اپنی ساری زندگی میں اس کے مسائل کی فہرست کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

جہاں تک قرآن شریف کے اعجاز بیان کا تعلق ہے تو اگرچہ قرآن شریف کا غیر معمولی اسلوب عربوں کے زمانہ فصاحت و بلاغت کے لہجہ کا ہم سنخ ہے جو کہ زبانوں کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے اور عربوں سے مختص تھا۔ لیکن عربوں کا یہ لہجہ پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کی فتوحات اور غیر عرب قوموں کے ساتھ امتزاج کے نتیجہ میں ناپید ہوگیا اور اس وقت صورتحال یہ ہے کہ آج کا عربی لہجہ، دوسری زبانوں کی طرح، اس دور کے لہجہ کی شیرینی سے بیگانہ ہے۔

لیکن قرآن شریف فقط اپنے اسلوب کی بنیاد پر مقابلہ کی دعوت نہیں دیتا بلکہ لفظی جہات کے علاوہ معنوی جہات سے بھی برتری کا مدعی ہے اور مقابلہ کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے باوجود عربی زبان کے جاننے والے اور نظم و نثر عرب میں تحقیق کرنے والے اس بات میں ذرا بھی شک و تردید

نہیں کرسکتے کہ قرآن شریف کا لہجہ اتنا حسین اور شیریں ہے کہ انسان کو اپنے حسن اور شیرینی کے ادراک سے عاجز اور زبان کو اپنی تعریف و ستائش میں گنگ کردیتا ہے۔ یہ شعر ہے نہ نثر' بلکہ اس کا اسلوب شعر و نثر دونوں کی کشش سے بالاتر ہے۔ قرآن شریف کی ایک آیت یا ایک جملہ بھی اگر بلیغ خطبا کے کسی خطبہ میں یا گزشتہ اور موجودہ فصیح اھل قلم میں سے کسی کی تحریر میں موجود ہو تو اس میں اس کی حیثیت ایسے چراغ کی مانند ہوتی ہے جو رات کے وقت کسی شبستان کی تاریکی کو مغلوب کئے ہوتا ہے۔

معنوی جہات میں بھی قرآن شریف کا اعجاز ابھی تک باقی ہے۔ اخلاقی اور اعتقادی معارف کا ایک وسیع سمندر اور فردی و معاشرتی عملی قوانین' جن کے اصول و کلیات کا ماخذ قرآن شریف ہے' اسقدر منظم اور خلل ناپذیر ہیں کہ جو انسان کے بس کی بات نہیں ہے' خصوصاً" ایسا انسان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں زندگی گزاری ہو۔

اسی طرح قرآن مجید کی طرح ایک یکساں اور ھماھنگ اجزا پر مشتمل کتاب کا نزول جو تیئیس برس کی مدت میں' مکمل طور پر مختلف حالات میں' آرام و سکون اور مشکلات و خوف' صلح اور جنگ' سفر اور حضر' خلوت اور جلوت میں' بغیر کسی اختلاف کے سورت سورت اور آیت آیت نازل ہوئی ہو' محال ہے۔

مختصر یہ کہ جو اوصاف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرآن میں تھے موجودہ قرآن میں بھی اسی طرح موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن شریف میں کسی قسم کی تحریف اور تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ خود اللہ تعالٰی نے قرآن شریف کی حفاظت کی خبر دی ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر:۹)

ترجمہ : بے شک ہمیں نے اس ذکر۔ قرآن۔ کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

وَاِنَّہٗ لَکِتَابٌ عَزِیْزٌ لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ (حم سجدہ: ۴۲)

ترجمہ : بے شک یہ ایک زبردست کتاب ہے جس میں کوئی باطل آگے یا پیچھے سے نہیں آسکتا' اسے خدائے حکیم و حمید نے بتدریج نازل کیا ہے۔

قرآن مجید ان دو آیات کی رو سے' خصوصاً" اس لحاظ سے کہ یہ اللہ تعالٰی کی طرف سے یاد آوری اور معارف حقہ کا راہنما ہے' اللہ تعالٰی کی حفاظت میں محفوظ ہے اور ہر قسم کے گزند سے اللہ تعالٰی کی امان میں ہے۔

اسی وعدۂ الٰہی کا نتیجہ ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اور اربوں دشمنوں کی موجودگی میں بھی قرآن مجید محفوظ و مامون ہے۔ یہ واحد کتاب ہے کہ اتنا طویل عرصہ محفوظ حالت میں انسانوں کے درمیان رہی ہے۔

☆ قرائت قرآن : حفظ و روایت

جیسا کہ ہم بارہا اشارہ کرچکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمان حیات میں ایک منظم جماعت مدینہ میں قرائت قرآن اور اس کے سیکھنے سکھانے میں مصروف رہتی تھی۔ یہ لوگ بتدریج نازل ہونے والی آیات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے سنتے تھے اور کبھی کبھی آپ کو سناتے بھی تھے۔

ان میں سے بعض تعلیم قرآن کے مصدر (استاد) تھے۔ جو لوگ ان سے سیکھتے تھے وہ اپنی قرائت کی کیفیت کو روایت کی صورت میں اپنے استاد کی طرف منسوب کرتے تھے اور جو کچھ سیکھتے تھے غالباً" اس کی حفاظت کے

لئے کوشاں رہتے تھے۔ اس وقت کے حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اسے اسی طرح حفظ اور نقل کیا جائے اس لئے کہ ایک تو اس دور میں رائج رسم الخط' خط کوفی تھا جس میں نقاط اور اعراب نہیں تھے اور ہر کلمہ مختلف اشکال میں لکھا جاتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عام طور پر لوگ ناخواندہ ہوتے تھے جن کے پاس حفاظت کلام کے لئے حفظ و روایت کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ لہٰذا یہی روش بعد کے دور کے لئے بھی یادگار رہی۔

☆ قراء کے طبقات

قراء کا پہلا طبقہ ان صحابہ کو ہی قرار دیا گیا ہے جو زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن شریف کی تعلیم و تعلم میں مشغول رہتے تھے۔ ان میں سے بعض نے تمام قرآن شریف جمع کرلیا تھا اور ان میں ایک خاتون بھی تھیں جن کا نام ام ورقہ بنت عبداللہ بن حارث تھا(۲۳)

(قرآن شریف جمع کرنے سے مراد' جو بعض روایات میں' بعض میں پانچ' بعض میں چھ اور بعض میں زیادہ افراد کی طرف منسوب ہے' پورے قرآن شریف کا سیکھنا اور حفظ کرنا ہے نہ کہ سورتوں اور آیات کی تالیف اور ترتیب۔ ورنہ خلیفہ اول و خلیفہ سوم کے زمانے میں جمع و ترتیب کے الفاظ بے معنی ہو جائیں گے۔ اسی طرح یہ بات بھی جو بعض روایات میں بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حکم سے ہر قرآنی سورت اور آیت کی جگہ مقرر فرمادی تھی۔ دوسری روایت اس کی تردید کرتی ہیں)

اور جیسا کہ بعض(۲۴) علما نے کہا ہے کہ اس طبقہ میں سے چند افراد قرآن شریف کے سیکھنے اور سکھانے میں مشہور تھے مثلاً" حضرت علی علیہ السلام' حضرت عثمان ' ابی بن کعب' زید بن ثابت عبداللہ بن مسعود اور ابو موسیٰ اشعری۔

دوسرے طبقے کے قراء پہلے طبقے کے شاگرد ہیں جو عموماً تابعین میں سے ہیں۔ ان میں سے جو معروف تھے انہوں نے مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام میں تعلیمی مراکز قائم کر رکھے تھے جن میں وہ قرائت قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ پانچ شہر ان شہروں میں سے ہیں جن میں مصاحف عثمانی موجود تھے۔

مکہ میں عبید بن عمیر، عطا بن ابی رباح، طاؤس، مجاہد، عکرمہ اور ابن ابی ملیکہ وغیرہ تھے۔

مدینہ میں ابن مسیب، عروہ، سالم، عمر بن عبدالعزیز، سلیمان بن یسار، معاذ قاری، عبداللہ بن اعرج، ابن شہاب زہری، مسلم بن جندب اور زید بن اسلم تھے۔ کوفہ میں علقمہ، اسود، مسروق، عبیدہ، عمر بن شرجیل، حارث بن قیس، ربیع بن خثیم، عمرو بن میمون، ابو عبدالرحمٰن سلمی، زر بن جیش، عبید بن نظلہ، سعید بن جبیر، نخعی اور شعبی تھے۔ بصرہ میں ابوعالیہ، ابورجا، نصر بن عاصم، یحییٰ بن یعمر، حسن بصری، ابن سیرین اور قتادہ تھے۔ شام میں مغیرہ بن ابی شہاب از اصحاب عثمان اور خلیفہ بن سعد از اصحاب ابی درداء (صحابی رسول) تھے۔

تیسرا طبقہ جو کہ دوسری صدی کے پہلے نصف سے تعلق رکھتا ہے مشہور آئمۂ قرائت پر مشتمل ہے، جس نے دوسرے طبقے سے علمِ قرائت حاصل کیا۔ ان میں سے مکہ میں عبداللہ بن کثیر (قراء سبعہ میں سے ایک) حمید بن قیس اعرج اور محمد بن ابی محیص تھے۔ مدینہ میں ابو جعفر یزید بن قعقاع، شیبہ بن نصاح، اور نافع بن نعیم (یکی از قراء سبعہ) تھے۔ کوفہ میں یحییٰ بن وثاب، عاصم بن ابی النجود (یکے از قراء سبعہ) سلیمان اعمش، حمزہ (یکے از قراء سبعہ) اور کسائی (یکے از قراء سبعہ) تھے۔ بصر میں عبداللہ بن ابی اسحاق، عیسیٰ بن عمر، ابوعمر، ابن علاء (یکے از قراء سبعہ) عاصم جحدری اور یعقوب خضری۔ شام میں عبداللہ بن عامر (یکے از قراء سبعہ)

عطیہ بن قیس کلابی' اسماعیل بن عبداللہ بن مہاجر' یحیٰی بن حارث اور شریح بن یزید حضرمی۔ چوتھا طبقہ تیسرے طبقے کے شاگردوں اور راویوں پر مشتمل ہے مثلاً" ابن عیاش' حفص اور خلف۔ ان میں سے جو زیادہ مشہور ہیں ان کا ذکر اگلی فصل میں آئے گا۔

پانچواں طبقہ اهل بحث و تالیف پر مشتمل ہے اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے قرائت میں تالیف کا کام انجام دیا وہ ابو عبیدہ قاسم بن سلام تھے۔ بعد ازاں احمد بن جبیر کوفی' اس کے بعد اسماعیل بن اسحاق مالکی قالون راوی کے اصحاب میں سے' پھر ابو جعفر ابن جریر طبری' اس کے بعد داجونی اور اس کے بعد مجاہد کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ان کے بعد بحث و تحقیق میں وسعت پیدا ہوگئی اور دانی(۲۶) اور شاطبی وغیرہ نے نظم و نثر میں بے شمار کتب و رسائل لکھے۔

☆ قراء سبعہ

قراء کے تیسرے طبقے میں سات افراد کو لوگوں میں بہت شہرت حاصل ہوئی اور وہ اس طرح مرجعیت کی صورت اختیار کرگئے کہ دوسروں پر چھا گئے۔ اگرچہ ان کے رواۃ کی تعداد زیادہ ہے مگر ان میں سے ہر ایک کے راویوں میں سے دو راوی متعین ٹھہرے۔

قراء سبعہ اور ان کے راوی مندرجہ ذیل ہیں :

۱ - ابن کثیر مکی(۲۷) اس کے راوی قنبل اور بزی ہیں' جنہوں نے ایک واسطہ سے نقل کیا ہے۔

۲ - نافع مدنی(۲۸) - اس کے راوی قالون اور ورش ہیں۔

۳ - عاصم کوفی(۲۹) - اس کے راوی ابوبکر شعبہ بن عیاش اور حفص ہیں۔ موجودہ دور میں جو قرآن لوگوں میں رائج ہے وہ قرائت عاصم بروایت حفص کے مطابق ہے۔

۴ - حمزہ کوفی(۳۰) - اس کے راوی خلف اور خلاد ہیں۔

۵ - کسائی کوفی(۳۱) - اس کے راوی دوری اور ابوالحارث ہیں۔

۶ - ابو عمرو بن علاء بصری(۳۲)۔ اس کے راوی ایک واسطے سے دوری اور سوسی ہیں۔

۷ - ابن عامر(۳۳) - اس کے راوی ایک واسطے سے ہشام اور ابن ذکوان(۳۴) ہیں۔

ان سات قراء کے بعد قرائت ثلاثہ کی قرائت مشہور ہے۔ جو ابو جعفر(۳۵)، یعقوب(۳۶)، اور خلف(۳۷) ہیں۔

ان کے علاوہ اور قرائتیں بھی نقل ہوئی ہیں جیسا کہ اصحاب سے مروی متفرق قرائتیں۔ اسی طرح بعض شاذ قرائتیں بھی موجود ہیں مگر ان کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا۔ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بھی متفرق قرائتیں نقل کی گئی ہیں لیکن انہی کی طرف سے دوسری روایات بھی موجود ہیں جو مشہور قرائتوں کی پیروی کا حکم دیتی ہیں۔ جمہور علمائے اہل سنت قراآتِ سبعہ کو متواتر سمجھتے ہیں یہاں تک کہ ایک جماعت نے تو اس معروف روایت نبوی(۳۸) : **نزل القران علی سبعتہ احرف** یعنی قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا، کی تفسیر میں یہاں تک کہہ دیا کہ اس سے مراد قراآت سبعہ ہیں اور یہ کہ یہ قراآت متواتر نہیں بلکہ مشہور ہیں۔

زرکشی(۳۹) نے اپنی کتاب "برہان" میں کہا ہے: "حق تو یہ ہے کہ یہ سات قرائتیں قراء سبعہ سے تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کا تواتر ثابت نہیں ہے، اس لئے کہ قراء سبعہ کی ان قرائتوں کی سند قرائت کی کتب میں موجود ہیں جو سب کی سب شخص واحد کے شخص واحد سے نقل کی مانند ہیں"۔

مکی(۴۰) اپنی کتاب میں لکھتا ہے: "جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ ان قراء کی قرائت ہی وہ سات حرف ہیں جن کا حدیث نبوی میں ذکر پایا جاتا ہے تو ایسا شخص فاش غلطی کا مرتکب ہوا ہے اس لئے کہ اس کا لازمہ یہ

ہے کہ ان سات قاریوں کے علاوہ کسی اور کی قرائت قرآن نہیں ہو سکتی اور یہ بہت بڑی غلطی ہے۔اس لئے کہ قدیم علماء مثلاً" قاسم بن سلام' ابوحاتم بجستانی' طبری اور اسماعیل قاضی جنہوں نے قرائتوں کو جمع اور تالیف کیا ہے' انہوں نے ان قاریوں سے کئی گنا زیادہ قاریوں کا ذکر کیا ہے۔

۲۰۰ ہجری میں بصرہ کے لوگ ابو عمر اور یعقوب کی قرائت کی پیروی کرتے تھے۔ کوفہ میں حمزہ اور عاصم' شام میں ابن عامر' مکہ میں ابن کثیر اور مدینہ میں نافع کی قرائت رائج تھی۔ ایک عرصہ تک یہی صورتحال رہی' یہاں تک کہ ۳۰۰ ہجری میں ابن مجاہد نے یعقوب کے نام کی جگہ کسائی کا نام لکھ دیا۔

اگرچہ قراء سبعہ جیسے یا ان سے بہتر بہت سے قاری بھی لوگوں میں موجود تھے مگر لوگوں نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور قراء سبعہ کی قرائت کو اختیار کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آئمہ قرائت کے راویوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور ان سب کو یاد اور محفوظ رکھنا دشوار ہوگیا تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ جن قاریوں کی قرائت مصحف کے رسم الخط کے مطابق اور یاد رکھنے میں آسان ہو' ان میں سے چند کا انتخاب کیا جائے۔ اس لحاظ سے پانچ مصاحف جو حضرت عثمان نے مکہ' مدینہ' کوفہ' بصرہ اور شام بھیجے تھے' ان کی تعداد کے مطابق ان پانچ شہروں میں سے پانچ قاریوں کا انتخاب کرکے ان کی قرائت کو اختیار کیا گیا۔

جیسا کہ ابن جبیر نے قراآت سے متعلق اپنی کتاب میں قراء سبعہ میں سے فقط ان پانچ شہروں کے پانچ قاریوں کا ہی مجاہد کی طرح ذکر کیا ہے۔

بعد ازاں مجاہد اور بعض دوسروں نے اس خبر کی بنیاد پر کہ حضرت عثمان نے دو اور مصحف یمن اور بحرین بھی بھیجے تھے (جس کے نتیجہ میں مصاحف کی تعداد سات بنتی ہے) سات قاریوں کا انتخاب کیا۔ مگر چونکہ

یمن اور بحرین بھیجے گئے مصاحف کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے لہٰذا سات کا عدد پورا کرنے کے لئے کوفہ کے قاریوں میں سے دو افراد کو گزشتہ پانچ قاریوں میں جمع کردیا گیا اور قراء کی تعداد سات ہوگئی۔

دوسری طرف سے اتفاق سے قاریوں کی یہ تعداد اس روایت نبوی کے اعداد کے مطابق ہوگئی کہ **نزل القران علی سبعتہ احرف**" اور یہ بات ان لوگوں کے ہاتھ آگئی جو اصل معاملہ سے نا آشنا تھے۔ لہٰذا ناچار انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ سات حرف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائے ہیں ان سے مراد یہی سات قراآت ہیں۔

بہر حال قابل اعتماد قرائت وہی ہے جس کی روایت کی سند صحیح ہو اور وہ قواعد عربی اور مصحف کے رسم الخط کے مطابق ہو" (مکی کی بات تمام ہوگئی)

قراب(۴۵) مثانی میں کہتا ہے : "یہ بات کہ صرف سات قراء کی قراءت کی ہی پیروی کی جائے، کسی اور کی نہیں" ایسی بات ہے جس کی تائید کسی حدیث یا سنت میں نہیں ہے، بلکہ بعض متاخرین نے ان سات قراآت کو جمع کرکے نشر کردیا، بعد میں یہ سمجھا جانے لگا کہ ان کے علاوہ کسی اور کی قرائت کو نہیں پڑھا جاسکتا حالانکہ ایسی بات کسی نے نہیں کہی ہے۔

☆ قرآنی آیات کی تعداد

قرآنی آیات کی تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے تک پہنچتی ہے اور آنحضرت سے مروی بعض روایات میں آیات کا عدد کے ساتھ ذکر موجود ہے مثلاً" سورہ آل عمران کی دس آیات۔ یہاں تک کہ آنحضرت سے بعض سورتوں کی آیات کی تعداد بھی نقل کی گئی ہے۔ مثلاً" یہ کہ سورہ(۴۶) حمد کی سات آیات ہیں اور سورۂ ملک(۴۷) کی تیس آیات ہیں۔ مگر جیسا کہ ابو عمرو دانی (۴۸) سے منقول ہے، قرآنی آیات

کی تعداد کے بارے میں چھ قول مشہور ہیں۔

(۱) ۶۰۰۰ آیات (۲) ۶۲۰۴ آیات (۳) ۶۲۱۴ آیات۔

(۴) ۶۲۱۹ آیات (۵) ۶۲۲۵ آیات (۶) ۶۲۳۶ آیات۔

ان چھ اقوال میں سے دو قول مدینہ کے قاریوں کے ہیں اور باقی چار قول دوسرے چار شہروں کے قاریوں کے ہیں جن میں مصاحف عثمانی موجود تھے یعنی مکہ، کوفہ، بصرہ اور شام۔

ان چھ اقوال میں سے ہر قول کے قائلین اپنی بیان کردہ تعداد کو روایت کے ذریعے زمانہ، اصحاب تک پہنچاتے ہیں اور پھر اسے روایت موقوفہ قرار دیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کردیتے ہیں۔ اس لحاظ سے جمہور، قرآنی آیات کی تعداد کو توقیفی سمجھتے ہیں۔

اھل(۴۹) مدینہ کے عدد دو ہیں۔ ایک ابو جعفر یزید بن قعقاع اور شیبہ بن نصاح کا عدد اور دوسرا عدد اسماعیل بن جعفر بن ابی کثیر انصاری کا ہے۔ اہل مکہ کا عدد ابن کثیر کا عدد ہے جو مجاہد سے، ابن عباس سے اور ابی بن کعب سے روایت کرتا ہے۔ اہل کوفہ کا عدد حمزہ، کسائی اور خلف کا عدد ہے جسے حمزہ نے ابن ابی لیلیٰ سے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کیا ہے۔ اہل بصرہ کا عدد عاصم بن حجاج جحدری کا عدد ہے اور اہل شام کا عدد ابن ذکوان اور ہشام بن عمار کا عدد ہے جسے وہ ابودرداء سے منسوب کرتے ہیں۔

البتہ قرآن شریف کی آیات کی مجموعی تعداد میں اختلاف کی وجہ سورتوں کی آیات کی تعداد کا اختلاف ہے۔ قرآن شریف کی سورتوں اور پورے قرآن شریف کے حروف اور کلمات کی تعداد کے بارے میں بھی اقوال و آراء موجود ہیں جن سے بحث کرنا ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

☆ قرآنی سورتوں کے نام

قرآن شریف کو آیات اور سورتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ دونوں تقسیمات قرآنی بنیادوں پر قائم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں متعدد مقامات پر "سورت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً" **سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا** (نور : ۱) **وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ** (توبہ : ۸۶) **فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ** (بقرہ : ۲۳) اور اس طرح کی دیگر آیات۔

سورت کا نام بعض اوقات اس سورت میں زیر بحث کسی واقعہ کی مناسبت سے رکھا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ اسراء اور سورۂ توحید وغیرہ۔ قرآن شریف کے پرانے نسخوں میں بکثرت دیکھا جاسکتا ہے کہ سورت کے آغاز میں لکھا ہوتا ہے **سورة تذکر فیها البقره** (وہ سورت جس میں گائے کا ذکر ہے)**سورت یذکر فیها ال عمران** (وہ سورت جس میں آل عمران کا ذکر ہے)

بعض اوقات سورت کے پہلے جملے کو بھی اس کا نام قرار دے دیا جاتا ہے مثلاً" "**سورۂ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ**" "**سورہ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ**" اور "**سورہ لَمْ یَکُنْ**" وغیرہ۔

اسی طرح بعض اوقات کسی سورت کی کسی صفت کو بھی اس کا نام قرار دے دیا جاتا ہے مثلاً" "**سورہ فاتحت الکتاب**" "**سورہ ام الکتاب**" "**سبع مثانی**" "**سورہ اخلاص(۵۰)**" "**سورہ نسبت الرب**" وغیرہ۔

دلائل اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ صدر اسلام میں بھی اسی روش پر عمل کیا جاتا تھا۔ حتی کہ احادیث نبوی میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآنی سورتوں کے نام مثلاً" سورۂ بقرہ، سورہ آل عمران، سورۂ ہود اور سورۂ واقعہ وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس بات کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بہت سے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں کثرت استعمال کی

وجہ سے متعین ہوگئے اور ان میں شرعی توقیف کا پہلو نہیں پایا جاتا۔

☆ قرآن شریف کے اعراب اور رسم الخط

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں اور پہلی اور دوسری صدی میں قرآن شریف خط کوفی میں لکھا جاتا تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے خط کوفی کے ابہام کی وجہ سے قرائت کے حفظ اور روایت کی شدید ضرورت تھی لیکن اس کے باوجود ابہام کا مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف حفاظ اور راوی ہی قرآن شریف کے صحیح تلفظ سے آشنا تھے۔ ہر شخص کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ مصحف کھول کر قرآن شریف کی تلاوت کرسکے۔

لہٰذا پہلی صدی کی آخر میں حضرت علی کے ایک صحابی(۵۱) ابوالاسود دئلی نے جنہوں نے حضرت علی علیہ السلام کے حکم پر عربی زبان کے قواعد تحریر کئے تھے، اموی خلیفہ عبدالملک کے حکم سے قرآن شریف پر نقطے لگائے۔ اس طرح رسم الخط کا ابہام کافی حد تک برطرف ہوگیا۔ اس کے باوجود ابہام کا مسئلہ پوری طرح سے حل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ علم عروض کے موجد معروف نحوی خلیل(۵۲) بن احمد نے مد، تشدید، زبر، زیر، پیش، سکون اور تنوین کی علامات وضع کیں جس سے تلفظ کی ادائیگی کا مسئلہ حل ہوگیا۔ اس سے(۵۳) پہلے کافی عرصہ تک حروف کی حرکات کو لفظوں کی مدد سے ظاہر کیا جاتا تھا۔ زبر کی جگہ حرف کے شروع میں اوپر کی طرف ایک نقطہ لگا دیا جاتا تھا۔ زیر کی جگہ حرف کے شروع میں نیچے کی طرف اور پیش کی جگہ حرف کے اوپر نقطہ لگا دیا جاتا تھا لیکن یہ طریقہ کار بعض اوقات مزید ابہام کا باعث بن جاتا تھا۔

ختم شد

کتاب کا ترجمہ ۳ شعبان المعظم ۱۴۱۴ ہجری (۱۹۹۴ء - ۱ - ۱۶) بروز ولادت حضرت امام حسین علیہ التحیتہ والسلام بعد از نماز فجر مکمل ہوا۔ میں اپنی اس ناچیز کاوش کو آپ کی بارگاہ مقدسہ میں بطور ہدیہ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ اس قابل تو نہیں مگر آپ کی بارگاہ کرم سے بعید نہیں کہ اسے قبول فرمالیں۔

اَلسَّلَامُ عَلَیکَ یَا اَبَا عَبدِاللّٰہِ الْحُسَیْنِ وَ عَلیٰ جَدِّکَ وَ اَبِیکَ وَاُمِّکَ وَاَخِیکَ وَ تِسعَتِ الْمَعْصُومِیْنَ مِنْ ذُرِّیَّتِکَ وَاَصحَابِکَ وَاَعوَانِکَ اَجْمَعِیْنَ وَ رَحمَتُہ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہ۔ والحمد للہ رب العالمین

حواشی

۱۔ ایجاز او اطناب علم بلاغت کی اصطلاحات ہیں۔ کسی بات کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے کو ایجاز اور زیادہ الفاظ میں بیان کرنے کو اطناب کہتے ہیں۔ (مترجم)

۲۔ سورہ بقرہ ہجرت کے پہلے سال مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس کی کچھ آیات یہودیوں کی سرزنش میں نازل ہوئیں جو اسلام کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض آیات قبلہ کی تبدیلی' روزہ اور حج وغیرہ کے احکام کے بارے میں نازل ہوئیں سورہ حشر بنی نضیر کے یہود کے اخراج اور سورہ عادیات وادی یا بس کے اعراب یا دوسرے اعراب کے بارے میں نازل ہوئی۔

۳۔ سورہ نسا خاص طور پر خواتین کے ازدواج اور وراثت کے بارے میں ہے۔ سورۂ انفال خاص طور سے جنگی قیدیوں اور غنائم کے بارے میں ہے جبکہ سورۂ طلاق' طلاق کے احکام کے بارے میں ہے۔

۴۔ کسی مضمون کو بیان کرتے وقت یا تو الفاظ اور معانی دونوں پر توجہ ہوتی ہے یا پھر بیان کرنے والا نقل شدہ الفاظ کو نظر انداز کرکے معانی کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ ثانی الذکر کو "نقل بہ معنی" کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

۵۔ اتقان ج ۱ ص ۱۰ مطبوعہ مصر

۶۔ اتقان ج ۱ ص ۱۰

۷۔ گزشتہ حوالہ

۸۔ درالمنثور ج ۴ ص ۱۸۷

۱۰۔ سورۂ نحل آیت نمبر ۴۴ اور بہت سی دوسری آیات

۱۱۔ توبہ : ۱۲۲

۱۲۔ اتقان ج ۱ ص ۷۲

۱۳۔ اتقان ج ۱ ص ۵۹

۱۴۔ مصحف بجستانی

۱۵۔ اتقان ج ۱ ص ۵۹ ۔ ۶۰

۱۶۔ اتقان ۔ ج ۱ ص ۶۲

۱۷۔ توبہ : ۳۴

۱۸۔ درالمنثور ج ۳ ص ۲۳۲

۱۹۔ درالمنثور ج ۳ ص ۳۶۹

۲۱۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے جمع شدہ قرآن کی ترتیب بھی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی تھی فرق صرف یہ تھا کہ حاشیہ پر تمام آیات کا شان نزول لکھا ہوا تھا جو حکومت کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ (مترجم)

۲۲۔ وافی ج ۵ ص ۲۷۳ ۔ باب اختلاف القرآن۔

۲۳۔ اتقان ج ۱ ص ۷۴

۲۴۔ اس فصل کی طبقہ بندی سیوطی کی الاتقان کے مطابق ہے۔ ان طبقات میں مذکور افراد کے حالات سے آگاہی کے لئے کتب رجال و تراجم کی طرف رجوع کیا جائے۔

۲۵۔ ریحانہ ج ۲ ص ۱۴۱ حمزہ زیات کے حالات اور اتقان ج ۱ ص ۷۵

۲۶۔ (دانی) ابو عمر عثمان بن سعید اندلسی مشہور قراء میں سے ہیں بہت سی کتب کے مولف ہیں ۴۴۴ ہجری میں فوت ہوئے۔

شاطبی بھی معروف قراء اور حفاظ میں سے ایک ہیں۔ قرائت میں آپ نے

ایک قصیدہ لکھا ہے جو قصیدہ شاطبیہ کے نام سے معروف ہے بقول صاحب کشف الظنون اس قصیدہ میں ۱۱۲۰ اشعار ہیں۔ ۵۹۰ ہجری میں قاہرہ میں فوت ہوئے۔

۲۷۔ عبداللہ بن کثیر مکی نے قرائت کو عبداللہ بن صائب صحابی اور مجاہد از ابن عباس از امیر المومنین اخذ کیاہے۔ ۱۲۰ ہجری میں مکہ میں فوت ہوئے۔

۲۸۔ نافع بن عبدالرحمن بن نعیم اصفہانی مدنی نے قرائت کو یزید بن قعقاع قاری اور ابو میمونہ سے جو کہ ام المومنین ام سلمٰی کے غلام تھے۔ اخذ کیا۔ ۱۵۹ یا ۱۶۰ ہجری میں مدینہ میں فوت ہوئے۔

۲۹۔ عاصم بن ابی النجود کوفی نے قرائت کو ابو عبدالرحمن سلمٰی از امیر امومنین اور سعد بن ایاس شیبانی اور زر بن حبیش سے اخذ کیا۔ ۱۲۷ یا ۱۲۹ ہجری میں کوفہ میں وفات پائی۔

۳۰۔ فقیہ اور قاری حمزہ بن حبیب زیات تمیمی کوفی نے عاصم، اعمش، سبیعی، منصور بن معتمر، امام جعفر صادق علیہ السلام اور ان کے اصحاب سے قرائت کو اخذ کیا۔ بہت سی کتب کے مولف ہیں انہوں نے سب سے پہلے متشابہ القرآن لکھی۔ ۱۵۶ ہجری میں وفات پائی۔

۳۱۔ علی بن حمزہ بن عبداللہ بن فیروز فارسی کوفی بغدادی آئمہ نحو میں سے ہیں اور دو عباسی خلفا امین اور مامون کے استاد بھی ہیں۔ نحو، یونس نحوی اور خلیل بن احمد نحوی عروضی سے سیکھی اور قرائت حمزہ اور شعبہ بن عیاش سے اخذ کی۔ ۱۷۹ یا ۱۹۳ ہجری میں عباسی خلیفہ ہارون کے ہمراہ طوس کا سفر کر رہے تھے کہ اثنائے سفر میں رے کے مقام پر وفات پاگئے۔

۳۲۔ ابو عمر زبان بن علاء بصری بغدادی اپنے دور کے معروف علمائے ادب اور اساتید قرائت میں سے تھے۔ انہوں نے قرائت کو تابعین سے اخذ کیا۔ ۱۵۴ یا ۱۵۹ ہجری میں کوفہ میں وفات پائی۔

۳۳۔ عبداللہ بن عامر شافعی دمشقی۔ اتقان کے مطابق انہوں نے قرائت کو ابی درداء صحابی اور اصحاب حضرت عثمان سے اخذ کیا۔ ۱۱۸ ہجری میں دمشق میں وفات

پائی۔

۳۴۔ قراء سبعہ میں سے ہر ایک کے راویوں کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو کچھ ہم نے یہاں بیان کیا ہے وہ الاتقان کے مطابق ہے۔

۳۵۔ ابو جعفر یزید بن قعقاع مدنی ام المومنین ام سلمہ کے غلام ہیں۔ یہ اپنی قرائت کو عبداللہ ابی عیاش مخزوی، ابن عباس اور ابو ھریرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ ۱۲۸ یا ۱۳۳ ہجری میں مدینہ میں فوت ہوئے۔

۳۶۔ یعقوب بن اسحاق حضرمی بصری آئمہ فقہ و ادبیات میں سے تھے۔ قرائت سلام بن سلیمان، از سلمٰی از امیر المومنین اخذ کی اور ۲۰۵ ہجری میں وفات پائی۔

۳۷۔ خلف بن ہشام بزاز آئمہ قرات میں تھے اور حمزہ کی قرائت کے راوی بھی تھے۔ مالک بن انس، حماد بن زید اور ابو عوانہ سے قرائت کو اخذ کیا اور ۲۲۹ ہجری میں وفات پائی۔

۳۸۔ بحار جلد قرآن اور صافی وغیرہ۔ سیوطی نے اتقان ج ۱ ص ۴۷ میں اس روایت کو ۱۲۰ صحابہ سے نقل کیا ہے۔ بعض نے ادعائے تواتر کو بھی اس کی طرف منسوب کیا ہے۔

۳۹۔ و (۴۰) اتقان ج ۱ ص ۸۲

۴۵۔ اتقان ج ۱ ص ۸۳۔ (۴۶) و (۴۷) اتقان ج ۱ ص ۶۸ (۴۸) اتقان ج ۱ ص ۶۹

۴۹۔ اتقان ج ۱ ص ۶۹ عبداللہ موصلی سے منقول۔

۵۰۔ چونکہ سورہ قل ھو اللہ خالص توحید پر مشتمل ہے اس لئے اسے سورۂ اخلاص کہا جاتا ہے اور چونکہ یہ اللہ تعالٰی کی توصیف کرتی ہے اس لئے اسے سورہ نسبت الرب کہا جاتا ہے۔ نسبت کے معنی توصیف کرنے کے ہیں۔

۵۱، ۵۲، ۵۳۔ اتقان ج ۲ ص ۱۷۱

ناشر:
مَجلسِ تَعلیمُ القرآن
۱۴/۲ - اے، جعفریہ کالونی، بند روڈ، لاہور